قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا پچھترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

نومبر 2019ء

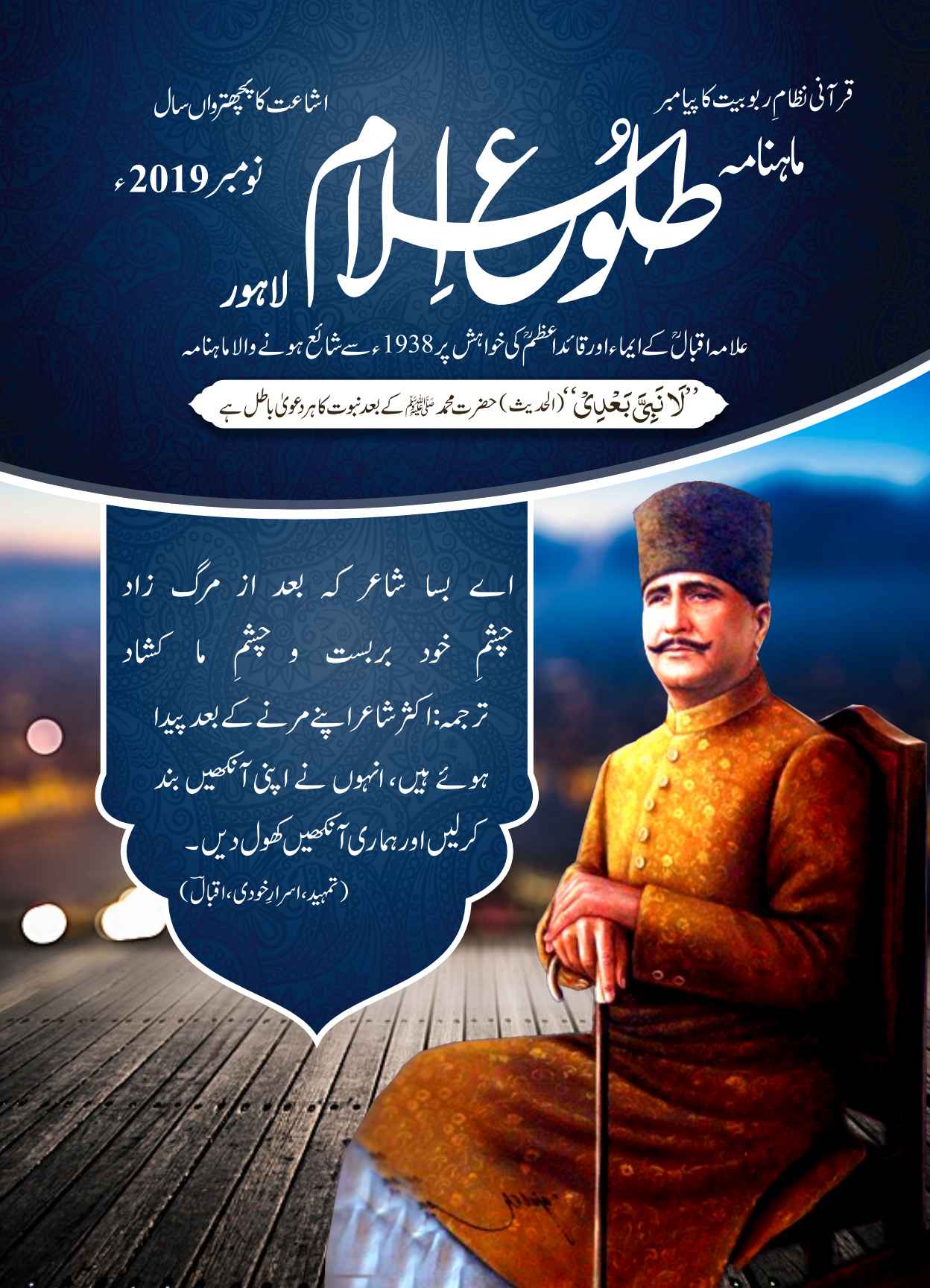
علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

''لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ'' (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشمِ خود بربست و چشمِ ما کشاد

ترجمہ: اکثر شاعر اپنے مرنے کے بعد پیدا ہوئے ہیں، انہوں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور ہماری آنکھیں کھول دیں۔

(تمہید، اسرارِ خودی، اقبالؒ)



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوب تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبال، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثرانداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال وعمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

نومبر 2019ء

جلد 71 شمارہ نمبر 11

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات	ادارہ	4
غلام احمد پرویز سے علامہ اقبال کے متعلق خصوصی انٹرویو	ایم، ایس، ناز	6
''انسان'' زندگی کی آخری کڑی نہیں ہے،۔۔۔	خواجہ ازہر عباس، کراچی	13
دوقومی قرآنی نظریہ پر مطالبہ پاکستان (قسط نمبر:32)	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	24
لغات القرآن: ج ھ ل جَھَنَّمُ اور ج و ب	پرویزؒ	36
نوجوانوں کا صفحہ: نخلِ سینا (نشست نمبر:2)	محمد علی صابر صدیقی	40
پاکستان اور دین اور سیاست (پرویزؒ کا خصوصی انٹرویو)	حنیف رامے (مرحوم)	44
بچوں کا صفحہ: عید میلاد النبی ﷺ	ادارہ	

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 550 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 800 روپے سالانہ
بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

Surah Muhammad (محمّد) - Durus-al-Qur'an: Chapter 6 By G. A. Parwez (Translated by: Mansoor Alam) Episode No. 2	59

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: 0321-4460787
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore
For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672
For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہؑ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ وبر پیدا
ربود آں ترکِ شیرازی دل تبریز وکابل را
صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا
ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز وسازِ زندگی کہ دے

(بانگِ درا۔علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

ہماری درخشندہ امیدیں اور تابناک آرزوئیں اسی خطۂ زمین سے وابستہ ہیں۔ ہم جس جنتی معاشرہ کا قرآنی تصور عام کر رہے ہیں' اس کی عملی تشکیل اسی خطہ میں ہو سکے گی۔ غیروں کے لئے یہ خطۂ زمین محض ایک مملکت ہے لیکن ہمارے لئے قرآنی زندگی بسر کرنے کا لاینفک ذریعہ اور نوع انسان کو موجودہ جہنم سے نکالنے کا دروازہ۔ اس سے ہمارے نزدیک اس کی سا لمیت کی اہمیت واضح ہے۔ ہمارے ایک طرف ہندو جیسے تنگ نظر دشمن کے مذموم عزائم ہیں جو اپنی کئی جُگوں کی غلامی اور محکومی کا انتقام ہم سے لینا چاہتا ہے۔ دوسری طرف ''واحد عالمی طاقت'' بلائے بے درمان ہے کہ ؎

اس سیلِ سبک سیرو زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

پھر خود ملک کے اندر ایسے عناصر موجود ہیں جو تحریک پاکستان کے سخت دشمن تھے اور اب مقدس نقابوں کی اوٹ میں' ملک میں تخریب و انتشار پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ آپ کو ہر طرح سے اشتعال دلائیں گے لیکن آپ نے ضبط کے دامن کو ہرگز ہاتھ سے نہیں چھوڑنا۔ آپ سے کوئی حرکت ایسی سرزد نہ ہونے پائے جس سے اس خطۂ زمین کے استحکام میں ضعف آنے پائے۔ اس لئے کہ ہماری درخشندہ امیدیں اور تابناک آرزوئیں اسی خطۂ زمین سے وابستہ ہیں۔

مرثیہ کیوں؟

آپ گھر میں ہوں یا دفتر میں، بازار میں ہوں یا دکان پر، ریل پر ہوں یا بس میں، تانگے میں ہوں یا میٹرو پر، بارات میں ہوں یا جنازے کے ساتھ — جہاں کہیں دو مسلمان جمع ہوں وہ مسلمانوں کی عام حالت کے مرثیہ خواں نظر آئیں گے۔

پہلے تو صرف اتنا ہی کہا جاتا تھا کہ قوم میں سخت اَفلاس ہے۔ لوگوں کے پاس کھانے کو روٹی، پہننے کو کپڑا اور رہنے کو مکان نہیں۔ بیمار پڑ جائیں تو دوائی نہیں اور مر جائیں تو کفن دفن تک کے لئے پیسے نہیں۔ اب اس کے ساتھ اس کا بھی اضافہ ہوتا ہے کہ لوگ بددیانت ہیں، بے ایمان ہیں، چور ہیں، جھوٹے ہیں۔ بلیک مارکیٹ، رشوت، نفع خوری، اعزّہ پروری اور اَقربا نوازی عام ہے۔ افراد سے آگے قوموں تک جایئے تو مسلمانوں کا تقریباً ہر ملک تباہ حال ہے۔ عوام میں جہالت اور غربت ہے، خواص خائن اور غدّار ہیں۔

یہ مرثیہ تو عام ہے لیکن کوئی یہ نہیں بتاتا کہ اس کی آخر وجہ کیا ہے؟

مسلمان کیوں ہر جگہ پستی اور ذلت میں ہیں؟

اگر آپ کو اس سوال سے دلچسپی ہے تو آپ یہ کتاب ضرور دیکھئے جس کا نام ہے:

اَسبابِ زوالِ اُمّت

کمپیوٹر کمپوزنگ اور کتابت کا حسین اِمتزاج

طباعت کا اعلیٰ ترین معیار

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) 25-بی، گلبرگ 2، لاہور
tolueislam@gmail.com ; www.islamicdawn.com
www.facebook.com/tolueislam.trust
Phone: +92 42 35753666

ایم۔ایس۔ناز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام احمد پرویز سے علامہ اقبالؒ کے متعلق خصوصی انٹرویو

س: علامہ اقبال سے آپ کی پہلی اور آخری ملاقات کب اور کہاں ہوئی؟ صحبتیں جو گزر گئیں، ان کی یاد تازہ کیجئے۔

ج: پہلی ملاقات کے متعلق تو متعین طور پر نہیں کہہ سکتا کہ کب اور کہاں ہوئی؟ اس لئے کہ وہ تو پچاس سال سے بھی زائد کا عرصہ ہے، آخری ملاقات البتہ ان سے جنوری 1938ء میں ہوئی، جب یوم اقبال، کی تقریب کے سلسلے میں دہلی سے ہمارا قافلہ لاہور آیا اور ان سے ان کی قیام گاہ پر ملاقات ہوئی۔ اس زمانہ میں یوں کہئے کہ وہ گویا بستر مرگ پر ہی تھے۔ بینائی بھی بہت کمزور تھی، بولنے میں ان کو بڑی تکلیف ہو رہی تھی، لیکن اس کے باوجود انہوں نے خاصا وقت ہمیں دیا۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ کچھ میری رعایت برتی، اس لئے کہ ہمارے صاحب کارواں علامہ اسلم جیراجپوری علیہ الرحمہ تھے، ان کے اکرام و احسان کی بدولت ہمیں بھی یہ سعادت نصیب ہوگئی۔ خاصا وقت اس میں صرف ہوا اور یہ آخری ملاقات ہے جو حضرت علامہ علیہ الرحمہ سے ہوئی۔ باقی رہے تاثرات، تو محترم سید نذیر نیازی صاحب نے اپنی کتاب ''اقبال کے حضور میں'' اس دن کی صحبت کا تفصیلی نقشہ پیش کیا ہے۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ ہم ان سے کس قسم کے سوال.....؟

سوال تو میں نہیں کہہ سکتا، میری حیثیت تو ان کے سامنے ایک ادنیٰ سے متعلم کی رہی، ہم تو استفادہ ہی کرتے تھے، جرأت کر لیتے تھے کچھ پوچھنے کی، اگرچہ وہ بہت جرأت دلایا کرتے تھے، حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے، ان کا تو انداز ہی ایسا تھا، وہ کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ کوئی بڑی شخصیت ہیں اور ان کے سامنے کچھ چھوٹے لوگ بیٹھے ہیں، وہ تو سب کو برابر کی حیثیت دیتے تھے اور بعض اوقات تو انکسار اور بھی بڑھ جاتا تھا، جو ہم لوگوں کے لئے حوصلہ افزا ثابت ہوتا تھا۔

س: پرویز صاحب! اقبال کے حضور میں اس وقت کوئی ایسا موضوع بھی زیر بحث آیا ہو، جس کا ذکر نذیر نیازی صاحب نے اپنی کتاب میں نہ کیا ہو؟

ج: میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ سوال اس میں آ گیا ہے یا نہیں، لیکن دو باتیں بڑی اہم ہیں، حضرت علامہ نے 'جاوید نامہ' میں مختلف ارواح یا مختلف ہستیوں سے عالم بالا میں ملاقات کی جو روئداد بیان کی ہے، میرے نزدیک حضرت سید احمد شہید علیہ الرحمہ اور ان کا معرکہ بالاکوٹ، ہمارے اس آخری دور کی اسلامی تاریخ میں بڑا پر عظمت ہے، سو میں نے اس موقعہ پر حضرت علامہ سے عرض کیا کہ جی چاہتا تھا کہ آپ سر سید اور سید احمد شہید، دونوں کی ارواح کو آمنے سامنے لا کر ذرا اس کا تقابل

بتاتے۔ اس پر حضرت علامہ نے فرمایا ''یہ اور اس قسم کے اور کئی سوال تھے جو بعد میں میرے ذہن میں آئے اور ایسا ہو جاتا ہے' اب جب بھی مجھے فرصت ملی میں ان چیزوں کو ضرور سامنے لاؤں گا''۔

اور ایک سوال' میں نے یہ عرض کیا کہ یہ جو قیامت کا واقعہ یا حقیقت ہے وہ ہمارے ذہن میں تو ہے کہ ہم انسان ایک دن اللہ رب العزت کے حضور پیش ہوں گے' لیکن قرآن میں تو ہے کہ تیرا خدا اور اس کے ملائکہ یہاں آئیں گے تو کیا یہ سارا ماجرا یہاں ہی ہوگا؟

انہوں نے کہا کہ حیات بعد ممات اور وہاں کے جتنے بھی نظریات ہیں' ان سب کے متعلق میرے ذہن میں ہے اور میں قرآن کریم کی تفسیر کی (introduction) میں اس سوال کو موضوع سخن بناؤں گا۔

س: حضرت علامہ کی صحبت میں جوان کے شیدائی بیٹھتے تھے' وہ کس قسم کے سوال کرتے تھے؟

ج: (مسکراتے ہوئے) یہ شیدائیوں کی بھی مختلف نوعیتیں اور قسمیں ہیں' آپ کا استفسار ہے کہ ان کے ہاں کس قسم کے لوگ بیٹھتے تھے؟ ان کی کیفیت تو بڑی دلچسپ ہے۔ حضرت علامہ چونکہ ڈاکٹر مشہور تھے۔ تو ایک دفعہ ایک شخص نے آ کر سوال کیا کہ میرے پیٹ کا درد بڑا پرانا ہے' کسی حکیم یا ڈاکٹر سے فائدہ نہیں ہوا' آپ مجھے کوئی اچھا سا نسخہ لکھ دیجئے۔

(قہقہہ لگاتے ہوئے) تو صاحب حضرت علامہ تو یہ بھی بتا دیا کرتے تھے۔ اسی طرح مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ موچی دروازے کا ایک جفت ساز ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا: ہمارا کاروبار پہلے خوب چلتا تھا' مگر جب سے انگریزی جوتے مارکیٹ میں آ گئے ہیں' ہمارا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا ہے' کسی نے ہمیں بتایا کہ علامہ صاحب بڑے اچھے مشورے دیتے ہیں' سو میں آپ سے مشورہ لینے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔

غرض کہ یہاں سے لے کر یورپ کے بڑے بڑے بلند پایہ مفکروں تک حضرت علامہ کی مجلس میں آیا کرتے تھے۔ ہر کوئی اپنی اپنی ذہنی سطح' افتادِ طبیعت اور مزاج کے مطابق سوال کرتا تھا اور اس کو اس کے مطابق ہی جواب ملتا تھا۔ ادیب' شعراء' فلاسفر اور خود مولوی صاحبان (مسکراتے ہوئے) پیر پرست لوگ بھی۔ کئی ایسے بھی تھے جو آ کر کہا کرتے تھے کہ حضرت کسی طرح سے آپ ڈاڑھی رکھ لیں' تو پھر دیکھیں کہ دنیا کیسے آپ کی گرویدہ ہو جاتی ہے۔ شیدائیوں اور سوالات کی تو یہ کیفیت ان کی محفل میں ہوتی تھی۔

س: بعض لوگ حضرت علامہ کو ڈاڑھی رکھنے کا مشورہ دیتے تھے' لیکن حضرت علامہ نے ایسا نہیں کیا!

ج: علامہ اقبال ان سے کہا کرتے تھے کہ بھئی اس وقت تک عام تاثر یہ ہے کہ دین کے متعلق وہ ہی کچھ کہہ سکتا ہے یا جان سکتا ہے' جس کی ایک خاص شبیہہ ہو' خاص وضع قطع ہو' اور یہ ہمارا جو نیا طبقہ' نئی نسل یا نوجوان طالب علم ہیں ان کے دلوں میں یہ (Complex) سا پیدا ہو گیا ہے' میں اس (Complex) کو دور کرنا چاہتا ہوں' کہ نہیں' تم بھی دین کو سمجھ سکتے ہو' تمہیں بھی دین کے متعلق معلومات حاصل ہو سکتی ہیں اور اس کے لئے میں اپنے آپ کو بطور ایک مثال کے پیش کرنا چاہتا ہوں کہ دیکھئے میری وضع قطع ایسی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود تم جانتے ہو کہ مجھے دین کے متعلق بہت کچھ معلوم ہے' یہ دنیا کہتی ہے

اور علماء کرام بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں' پس اس (Complex) کو نکال دو کہ جب تک تمہاری ایک خاص وضع قطع نہ ہو گی تم دین کا علم حاصل نہیں کر سکو گے یا دین کے متعلق کچھ نہیں جان سکو گے۔

س: اقبال کے افکار کی وسعت' ان کی بلندی اور ان کی گہرائی بے پایاں ہے۔ آپ نے علامہ کے افکار کے حوالے سے ان کی شخصیت کے کس پہلو کو زیادہ نمایاں طور پر محسوس کیا؟

ج: میں قرآن کا طالب علم ہوں اور قرآن ہی کی کشش سے میں حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے قرآن کریم کے متعلق جو کچھ کہا اس کا میرے دل پہ بڑا اثر تھا اور اثر یہ ہے کہ قرآن کریم کا سمجھنا میں نے حضرت علامہ سے سیکھا تھا۔ ان کی شخصیت کا یہی پہلو تھا جو مجھے ان کے قریب لے آیا۔ انہوں نے اپنی پہلی تصنیف ''اسرار خودی'' یا ''رموز بیخودی'' کے آخر میں کہا ہے کہ جو کچھ میں نے سمجھا ہے' اپنی بصیرت کے مطابق قرآن ہی سے سمجھا ہے۔ قرآن کریم کی عظمت اور اس کا احترام میرے دل میں بھی چونکہ بدرجہ نہایت تھا' اس لئے میں جو ان کے قریب ہوا' تو اس کی یہی وجہ تھی۔ باقی چیزیں وہ قرآن کے تابع رکھتے تھے مثلاً دنیا بھر کے علوم پر ان کی نگاہ تھی' لیکن کسی علم یا مذہب کے متعلق جو بحث بھی وہ چھیڑتے' آخر میں وہ قرآن کی طرف آ جاتے اور فرمایا کرتے تھے کہ قرآن اس کے متعلق یوں کہتا ہے۔ میرے نزدیک ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں اور جاذب پہلو ان کی یہ بصیرت قرآنی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان کی شخصیت کو سمٹایا جائے' تو ان کے افکار کی وسعت' ان کی بلندی اور ان کی گہرائی' سب کچھ اس میں سمٹ کر آ جاتا ہے۔

س: علامہ ایک مستقل نظام فکر رکھنے والے معاشرہ کی تشکیل چاہتے تھے' ان کے نزدیک اس مثالی معاشرے کے خدوخال کیا تھے؟

ج: ہاں' یہ وہ سوال ہے جس میں حضرت علامہ کا سارا پیغام سمٹ کر آ جاتا ہے۔ درحقیقت قرآن سے پہلے پوری دنیا میں مذہب کے متعلق تاثر' خیال اور عقیدہ یہ تھا کہ یہ خدا اور بندے کے درمیان ایک نجی تعلق (Private Affair) کا نام ہے جو پوجا پاٹھ' پرستش' بندگی اور عبادت کے ذریعے سے قائم ہوتا ہے یا مراقبوں اور ریاضتوں کے توسل سے' دنیاوی معاملات سے ان کا کوئی تعلق نہیں' مگر قرآن حکیم نے آ کر اس کی تردید کی اور بتایا کہ نہیں' ایسا ہرگز نہیں' ضمناً مذہب کا لفظ تو قرآن میں ہے ہی نہیں' اس میں دین کا لفظ ہے' ہماری یہ بدبختی ہے کہ قرآن حکیم یا عربی زبان کے یہ جو الفاظ ہیں' ان کے مترادفات دنیا کی کسی بھی زبان میں نہیں ہیں' جب ہم ان کا ترجمہ کرتے ہیں تو ان زبانوں میں جو (Concepts) یا تصورات ہوتے ہیں وہیں سے ہم یہ الفاظ لیتے ہیں' اس لئے ہم نے دین کا مترادف مذہب (Religion) لیا۔ جو صحیح نہیں ہے۔ قرآن یا اسلام درحقیقت مذہب کے خلاف ایک چیلنج ہے۔ حضرت علامہ بھی جو کتاب لکھنا چاہتے تھے اور جس کے لئے وہ (Notes) چھوڑ گئے' انہوں نے ایک فقرے میں یہ کہا ہے کہ:

''اسلام (Religion) کے خلاف (Protest) ہے''

صد حیف کہ اقبال وہ کتاب لکھ نہ سکے۔ میں یہ کہنے کی جسارت تو نہیں کر سکتا کہ میں نے ان کے موضوع کو اپنایا' بہرکیف

یہ ان ہی کا فیضان ہے کہ میں نے Islam, A Challenge to Religion لکھی۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام مذہب کے خلاف ایک چیلنج تھا۔ مذہب کا جو تصور (Concept) رہا ہے کہ دنیوی معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں، قرآن نے اس کو غلط ثابت کیا ہے۔ بنابریں وحی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیوی امور کو ابدی اقدار کے تابع رکھ کر حل کرے۔ حضرت علامہ نے اسے ایک مصرعہ میں یوں سمو دیا ہے کہ ؎

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد

دین کی چابی سے دنیا کے ہر دروازے کو کھولا جا سکتا ہے اور یہی ہے دین اسلام کا کام، قرآن نے ہمیں یہی سکھایا ہے۔ اب جہاں تک دنیوی امور کا تعلق ہے، ان میں مملکت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ دنیوی امور دراصل مملکت ہی کے ذریعے طے پاتے ہیں، گویا اسلام وہ ہے جس میں مملکت اقدار خداوندی کے تابع رہ کر دنیوی معاملات کا حل پیش کرتی ہے اس میں مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں رہتے بلکہ ایک ہو جاتے ہیں۔ حضرت علامہ اس بارے میں اتنے محتاط تھے کہ انہوں نے لکھا ہے:

''میں تو یہ کہوں گا اور تمہیں یہ بھی نہیں کہنا چاہئے کہ: یہ ایک حقیقت کے دو رخ ہیں''۔

مقصود حضرت علامہ کے کہنے کا یہ تھا کہ دو رخ ہونے میں بھی کچھ ثنویت (Dualism) کا تاثر آ جاتا ہے اس لئے کہ ؎

گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میں عرض کروں گا کہ جب اسلام میں ملوکیت در آئی تو اس نے آ کر پھر یہ ثنویت پیدا کر دی۔ مملکت، سلطنت اور دنیا کے معاملات حکومت نے اپنے پاس رکھ کر ایک الگ دائرہ قائم کر لیا۔ مذہب کے معاملات انہوں نے علماء کو دے دیئے، اس طرح سے دو علیحدہ علیحدہ مملکتیں قائم ہو گئیں، جنہوں نے باہم معاہدہ کر لیا کہ وہ ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔ اس طریق کار سے وہ تصور ابھر آیا، جو اسلام سے پہلے رائج تھا اور جس کو مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ ہمارے ہاں ہزار برس سے یہی تصور چلا آ رہا تھا، ثنویت چونکہ حکومت اور مذہبی پیشوائیت دونوں کے لئے مفید تھی، اس میں دونوں کو الگ الگ اقتدار کے دوائر حاصل تھے، اس لئے حکومت نے تو اس کو مستحکم سے مستحکم تر کرنا ہی تھا، مذہب پرست طبقے نے بھی ہمارے ہاں ان گروہوں کو اور زیادہ مضبوط کیا، چنانچہ کیفیت یہ ہو گئی کہ اذہان نے اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ مملکت اور مذہب یکجا ہو سکتے ہیں، حضرت علامہ کا یہ زندہ جاوید کارنامہ تھا کہ انہوں نے فرمایا ؎

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

حضرت علامہ واشگاف انداز میں فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کی رو سے اسلام ایک نظام زندگی ہے، ایک ضابطہ حیات ہے، جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو مستنیر کرتا ہے۔ عبادت، مناصب اور امور مملکت کو اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور یہ اسی صورت میں زندہ ہو سکتا ہے کہ اپنی ایک آزاد مملکت ہو۔

س: حضرت علامہؒ کے ذہن میں کس قسم کے مستقل نظام کا نقشہ تھا؟

ج: وہ ابدی حقائق، اصول یا اقدار، جو خدا کی طرف سے ودیعت کئے گئے، وہی مستقل اور غیر متبدل ہیں۔ حضرت علامہ نے یہ تصور دیا تھا کہ آپ ان مستقل اقدار کو بطور حدود کے لیجئے، یہ غیر متبدل رہیں گی۔ ان حدود کے اندر رہ کر بھی زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزوی قوانین یا اس کے جزوی پروگرام کی جزئیات، ہر دور کی امت باہمی مشاورت سے خود متعین کرے گی، اس طرح سے یہ غیر متبدل اور تغیر کے امتزاج سے زمانے کے ساتھ ساتھ بلکہ زمانے کی امامت کرتا ہوا نظام آگے بڑھے گا۔ مستقل نظام کی یہ ایک شکل ان کے ذہن میں تھی۔ اقبال، قرآن حکیم کو اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب سمجھتے تھے، ان کا ایمان تھا کہ اس کتاب کو قیامت تک کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن قیامت تک امت کی ہر سیاست، مملکت اور امور دنیا کا ایک دستور اساسی رہے گا، اس اعتبار سے یہ ایک مستقل نظام ہوا، لیکن جو اس کی جزئیات ہیں، وہ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی چلی جائیں گی۔ بالفاظ دیگر مستقل اور تغیر پذیر عناصر کے امتزاج سے یہ نظام بنتا ہے۔ مستقل نظام کا یہی نقشہ حضرت علامہ کے ذہن میں تھا۔ یہ تصور انہوں نے قرآن سے لیا اور یہی قابل عمل تصور تھا۔ اقبال چاہتے تھے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی ایک الگ مملکت ہو، جس میں اس نظام کو نافذ کریں اور اس کی جزئیات کو ممکن العمل بنائیں، اور اس کے جو انسانیت ساز نتائج ظہور پذیر ہوں، انہیں دیکھ کر پہلے مسلمان مملکتیں غالباً اور اس کے بعد دنیا کی دوسری اقوام بھی اس کی طرف لپک کر آ جائیں گی۔

س: اقبالؒ کے ذہن میں اسلامی نظام کا کیا تصور تھا؟

ج: اس زمانہ میں سب سے بڑا اعتراض یہ پیدا ہوا تھا کہ مسلمانوں میں اس قدر فرقے ہیں جن کی موجودگی میں ایک اسلامی مملکت، ایک اسلامی نظام یا ایک اسلامی دستور پر متفق ہونا کیسے ممکن ہے؟ علامہ اقبال اس کے جواب میں فرماتے تھے:

''ٹھیک ہے، فرقوں کی موجودگی میں جانتا ہوں، لیکن ان سب کے اندر قرآن ایک قدر مشترک ہے؟ اگر ان کی اساس قرآن ہوگی، تو اس سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا''۔

''فکری روابط کی بڑی اہمیت ہے، ان حضرات (ائمہ کرام، جنہوں نے فقہ مرتب کی) نے اپنے اپنے وقت میں بڑا کام کیا ہے۔ میں اس کی قدر کرتا ہوں، لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود یہ قانونی ضوابط بال آخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں، اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے''۔

حضرت علامہؒ کہتے تھے کہ یہ پچھلے حالات تھے، مگر اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیائے اسلام ان تمام نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے، جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکر انسانی کی نشوو ارتقاء سے وجود میں آ گئی ہیں، اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔۔ اس لئے انہوں نے کہا کہ:

''خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عمل ارتقاء ہے، اس کی مقتضی ہے کہ---''۔

یہ ہیں وہ الفاظ جو بڑی اہمیت رکھتے ہیں:

''ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے

رہنمائی لے سکتی ہے، لیکن اسلاف کے فیصلے اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتے۔''

حضرت علامہ اقبالؒ کے چھٹے خطبے میں، جس کا ایک اقتباس میں نے سنایا ہے، اس کی تفصیل ملتی ہے۔ یہی وہ عملی طریق یا پروگرام ہے، جس کی رو سے وہ اس سرزمین کو اسلامی نظام کا گہوارہ دیکھنے کے متمنی تھے۔

س: اقبال نے جس جہانِ نو کا خواب دیکھا تھا۔ کیا ہم اس کے مطابق صحیح رخ پر آگے بڑھے ہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

ج: پیش رفت تو درکنار، ہم بہت پیچھے چلے گئے ہیں جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے کہ 1930ء میں جب حضرت علامہ نے یہ تصور پیش کیا تو کہیں سے کوئی آواز نہ اٹھی تھی۔ 1938ء سے 1940ء تک قائداعظم جب اس تصور کو لے کر آگے بڑھے تو بیم ورجا کا عالم تھا، اس زمانے میں مخالفت کچھ سطحی سی تھی اس کے بعد جب یہ تصور عملی صورت اختیار کرنے لگا تو مخالفت نظریاتی ہوتی چلی گئی اور اس میں تندی و تیزی اور تلخی بھی آتی چلی گئی۔ بالآخر پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مملکت کیا تھی؟ یہ تصور کیا تھا؟ یہ عمل کیا تھا؟ یہ عمل، یہ تصور اور یہ مملکت ثنویت کو مٹانے کے لئے تھی۔ پاکستان میں اقبال کے تصور کا اسلامی نظام اسی صورت میں قائم ہوسکتا تھا کہ یہ ثنویت باقی نہ رہتی۔

اس میں کلام نہیں کہ اسلام کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر حکمرانی کا حق نہیں دیتا، اقتدار کی کوئی بھی شکل ہو، اسلام انسانوں پر اقتدار کو ختم کر دیتا ہے۔

اگر پاکستان میں اقبال کے تصور کی مملکت معرض وجود میں آ جاتی تو مذہبی پیشوائیت کی یہاں کوئی گنجائش نہ رہتی، حکمران طبقے نے اپنے دور کے سیکولر نظام یہاں رائج کئے۔ نام تو سارے اسلام کا لیتے رہے، کیونکہ اسلام کے نام پر دس سال بلکہ اس سے بھی زیادہ یعنی 1930ء سے جنگ لڑی تھی، اب یہ کس طرح ممکن تھا کہ یہ لوگ اسلام کا نام لئے بغیر اپنے مقاصد کو عملی جامہ پہنا سکتے۔

یہاں مجھے اجازت دیجئے کہ درمیان میں کہیں ''میں'' آ جائے، جس سے میں ہمیشہ گریز کرتا رہا ہوں، میں طبعاً کچھ ایسا واقع ہوا ہوں، لیکن بعض دفعہ؟ ؎

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

افسوس، اقبال نے جس جہان نو کا خواب دیکھا تھا، وہ پورا نہ ہوسکا۔ مگر میں مایوس نہیں ہوں۔ اقبال نے وہی کچھ کہا جو قرآن نے کہا ہے اور ہمارا تو ایمان ہے کہ اس نظام (اسلام) نے دنیا کے ہر نظام پر غالب آ کر رہنا ہے۔ اگر ہم شروع ہی سے نوجوان طبقے بالخصوص طلباء کے نصاب ہی سے اقبال کو لازم کر دیتے تو آج ہمیں قنوطیت کا شکار نہ ہونا پڑتا۔ اب بھی اگر یہ انتظام ہو جائے تو اقبال کا تصور نئی نسل کے رگ و ریشے میں سما سکتا ہے۔ میں تو اقبال کے اس تصور کو، اس پیغام کو عام کرتا رہوں گا، یہ میرے ایمان کا جزو ہے، یہ میرے دین کا فریضہ ہے۔ آخر میں، میں عرض کروں گا کہ علی گڑھ یونیورسٹی قائم ہوئی، تو پاکستان کی مملکت معرض وجود میں آ گئی، اگر یہاں بھی ایک ایسی درسگاہ قائم ہو جائے اور اقبال کے تصور کو نصاب کا حصہ بنا دیا

جائے‘ تو اقبال نے جس جہان نو کا خواب دیکھا تھا‘ وہ شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے۔ (ہاں)۔ حضرت علامہ نے فرمایا تھا:

’’زود یا بدیر یہ سوال مسلم اقوام کے سامنے آنے والا ہے کہ اسلامی قوانین شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں؟ اصل مسئلہ یہ ہے۔ یہ سوال بڑا اہم ہے اور بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی‘ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات میں ہونا چاہئے‘ بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے‘‘۔

اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اقبال کے پیغام اور ان کی فکر کو عام کرنے کے لئے ہم کہاں تک آگے بڑھے ہیں؟ اور اگر نہیں بڑھے تو کس سمت کو جا رہے ہیں۔ درحقیقت مخالفینِ اقبالؒ کی خواہش ہے کہ ؎

ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

اس دور میں جس کو شرعِ پیغمبری یا نظامِ اسلامی کہا جا سکتا ہے وہ تو اقبال کے تصور سے پیدا ہوتا ہے‘ (اور اب) ہم آہستہ آہستہ وہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ مذہبی پیشوائیت جس کا دائرہ ابتداء میں مذہب تک محدود تھا اب سیاست میں بھی در آیا ہے‘ حالت یہ ہوگئی ہے کہ ہم آگے نہیں بڑھے‘ بلکہ بہت پیچھے چلے گئے ہیں‘ اور ہماری یہ کیفیت تاریخ کے کسی دور میں بھی نہیں ہوئی کہ مذہب پرست طبقہ سیاست کے اوپر آ کر حاوی ہو جائے۔

س: کیا یہ بات نہیں کہ اقتدار ہمیشہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں رہا‘ جو مذہب سے بیگانہ تھے اور صرف سیاست جانتے تھے؟ اس لئے اگر یہ تجربہ بھی دیکھ لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے؟

ج: مگر میری ذاتی رائے میں اگر انتخابات میں ایسا ہوا‘ تو ہوسکتا ہے‘ مذہبی طبقہ اس فکر میں ہے کہ اقبالؒ کی فکر آگے نہ آئے۔ حکمران طبقوں کے مفاد میں بھی یہ بات ہے کہ سیکولر نظام ہی رہے۔ سرمایہ دار طبقہ کی بھی یہی خواہش ہے‘ کیونکہ یہ ان کے مفاد میں ہے‘ اقبال اور قرآن سرمایہ داری کے مخالف ہیں۔ (یہ سب گروہ) فکر اقبال کے مخالف ہیں کیونکہ یہ طبقے نہیں چاہتے کہ یہاں سلامی نظام رائج ہو جائے۔

س: تو پھر اقبال کی فکر کو عام کون کرے گا؟

ج: جس کو جرأت نصیب ہوگی‘ وہی اقبال کی فکر کو عام کرے گا۔ ایسی جرأت جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر فاروقؓ کو بخشی تھی‘ بقول اقبال:

’’وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے وہ جسے رسول اللہ صلعم کی حیات طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے‘‘۔

جرأت کے فقدان کے بغیر اقبال کا تصور یا پیغام عام نہیں ہوسکتا۔ جرأت کے بغیر یہ تصور‘ یہ پیغام یا تو شاعری ہو جائے گا یا پھر قوالوں کی ڈھولک پر گایا جائے گا۔

(بشکریہ فکر و نظر‘ اسلام آباد‘ نومبر‘ دسمبر 1977ء)

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''انسان'' زندگی کی آخری کڑی نہیں ہے،
ریاستِ مدینہ اس کو اگلی کڑیوں پر فائز کرتی ہے

قرآنِ کریم کا دعویٰ ہے کہ عقل انسانی خیر وشر میں تمیز کرنے سے قاصر ہے یہ تمیز صرف اور صرف وحی الٰہی کر سکتی ہے (2:216)۔ قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ بہت بڑا دعویٰ ہے۔ ہمارے موجودہ دور کی عقل بھی خیر وشر میں تمیز نہیں کر سکی۔ اب تک مغربی مفکر بھی Good & Evil کو Define نہیں کر سکتے۔ اسی لئے قرآنِ کریم نے انسانوں کو قانون سازی کا اختیار نہیں دیا۔ اس کا دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ عقل انسانی جو قانون بھی بناتی ہے وہ کفر، ظلم اور فسق پر مبنی ہوتا ہے (5:44، 5:45، 5:47)، قرآن کریم کے اس دعویٰ پر ماہرین قانون ہی تبصرہ کر سکتے ہیں۔ جب عقل انسانی خود ساختہ قانون نہیں بنا سکتی تو نظامِ زندگی کیسے بنا سکتی ہے۔ عقل انسانی، کسی بھی نظام کی اساس نہیں ڈھونڈ سکتی۔ علامہ اقبال نے کمیونزم پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

ای کہ می خواہی نظامِ عالمی
جستہ ای او را اساسِ محکمی؟

ترجمہ: کہ ایک نظامِ عالم کی تلاش میں ہو، کیا تم نے اس نظام کی بنیاد بھی تلاش کی ہے۔

قرآن کریم ایک انسان کی حکومت دوسرے انسانوں پر جُرم قرار دیتا ہے (6:123) اس کا ارشاد ہے ۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے ایک وہی باقی بتانِ آذری

حضور ﷺ نے بڑی محنت اور کوشش کے بعد ریاستِ مدینہ قائم فرمائی۔ اس ریاست کی یہ خصوصیت تھی کہ اس میں قانون نافذ کرنے والا اپنی ذات کو قانون سے الگ رکھتا تھا۔ اس ریاست کو حضور ﷺ کے اپنے دور میں 82 دفاعی لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ یہ ریاست اس قدر مضبوط تھی کہ اس نے حضرت عمرؓ کے دور میں ایران اور اس کا نواحی علاقہ فتح کر لیا تھا۔ اس فتح کی ایک وجہ تو بہت ظاہر ہے جو سب لوگوں کے علم میں ہے کہ روما کی حکومت اور ایران کی حکومت ایک عرصۂ دراز سے آپس میں لڑتی چلی آ رہی تھیں۔ جب ہرمزان قید ہو کر حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوا تو حضرت عمرؓ نے اس سے دریافت فرمایا کہ

اے ہرمزان تم تو بہت بڑی سلطنت اور بہت بڑی طاقت تھے۔تم تو عربوں کو کسی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔اب یہ کیا ہوا کہ تم اس درجہ کمزور ہو گئے کہ ہم نے تمہیں فتح کر لیا۔اس سوال کے جواب میں جو ہرمزان نے کہا وہ نکتہ قابلِ غور ہے اس نے حضرت عمرؓ سے کہا ''کل تک طاقت کا مقابلہ طاقت سے تھا جس میں ہم تم سے بہت بڑھے ہوئے تھے۔خدا نہ تمہارے ساتھ تھا نہ ہمارے۔اب جس وقت ہم تم سے لڑتے ہیں تو تمہارا خدا تو تمہارے ساتھ ہوتا ہے، ہمارے ساتھ خدا نہیں ہوتا۔'' یہی بات جو ہرمزان نے کہی تھی۔اس بات کو قرآن کریم نے اس طرح بیان فرمایا ہے ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ ﴿۱۱﴾ (47:11) ترجمہ: یہ اس لیے ہے کہ اللہ مومنین کا سرپرست ہے اور کارساز ہے اور کافروں کا کوئی سرپرست اور کارساز نہیں ہوتا۔

چودہ صدیاں گزر گئیں خلافتِ راشدہ کے بعد سے ہم مسلمانوں نے نہ دین قائم کیا نہ ہمیں اللہ کی مدد حاصل ہوئی۔ ریاستِ مدینہ اس قدر مضبوط تھی کہ یہ چند صدیوں تک اپنے Momentum پر چلتی رہی۔پھر مسلمانوں کو جو زوال ہوا تو آج تک مسلمان این سُوراندہ وآں سورماندہ ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔

وزیراعظم عمران خان خراجِ تحسین کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ریاستِ مدینہ قائم کرنے کا عزم تو ظاہر کیا ہے۔ہم نہایت دل سوزی اور خلوص سے ان سے عرض کرتے ہیں کہ ریاست مدینہ جب ہی قائم ہوسکتی ہے جب آپ کے نظریات قرآن کے مطابق ہوں۔قرآنِ کریم جن نظریات پر ریاست قائم کرنا چاہتا ہے۔ان نظریات کا علم ہونا اور ان نظریات کے مطابق کوشش، جدوجہد کرنا نہایت ضروری ہے۔اگر آپ کے نظریات ہی قرآن کے خلاف ہیں۔ریاست قائم کرنے کے خلاف ہیں۔تو آپ ریاستِ مدینہ قائم نہیں کر سکتے۔مسلمانوں کی بدقسمتی ہی یہ ہے کہ ہم مسلمانوں اور ہمارے علماء کرام کے نظریات ہی ریاست قائم کرنے کے خلاف ہیں۔اس مضمون میں ان خلافِ قرآن، اور اقامتِ دین کے خلاف عقائد کی نشاندہی کی جائے گی۔ریاستِ مدینہ کی اساسات بالترتیب درج ذیل ہیں۔ان اساسات کی تفصیل پیشِ خدمت عالی کی جاتی ہے۔

(1) ذاتِ انسانی، یا نفس انسانی پر ایمان، اور روحِ انسانی اور روحانیت کی تردید

(2) مکافاتِ عمل پر ایمان

(3) صفاتِ خداوندی کے انعکاس پر ایمان

(4) مستقل اقدار پر ایمان

(5) عبادت خداوندی کے معنی اللہ کی محکومی ہے۔پرستش نہیں ہے، دین میں پرستش کی کوئی گنجائش نہیں۔

قرآنِ کریم کی رُو سے زندگی The Life انسانوں کی پیدائش سے پہلے سے موجود تھی (76:1)، جب اس زندگی نے پیکر اختیار کر لیا تو قرآن کریم نے اس کا ذکر شروع کیا ہے۔جرثومۂ حیات Life Cells، زندگی کا پہلا پیکر ہیں، سعدی

شیرازی تیرہویں صدی کے شاعر ہیں انہوں نے اس دور میں فرمایا تھا:

باد و خاک و آب و آتش بندہ اند
با من و تو مردہ، با حق زندہ اند

آپ زمین میں ایک گٹھلی بو دیں۔ اپنے وقت کے مطابق وہ درخت بن جائے گی، یہ زمین کی زندگی ہے جو اس گٹھلی کو درخت بنا دیتی ہے۔ نباتات، حیوانات کی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ یہ زندگی ہزاروں، لاکھوں سال آہستہ آہستہ، منزل بہ منزل، ترقی کرتی ہوئی حیوانیت کی سطح پر پہنچی۔ زندگی جب حیوانیت کی سطح سے آگے بڑھی اور جب یہ اگلی منزل میں داخل ہوئی۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس زندگی کو اپنی طرف سے ایک توانائی ایک صلاحیت عطا فرمائی جس کو قرآنِ کریم نے روح کے لفظ سے تعبیر کیا۔ یہ توانائی جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتی ہے تو یہ روحِ خداوندی کہلاتی ہے اور جب یہ توانائی انسانیت کو ملی تو قرآنِ کریم نے اس کو لفظ نفس سے تعبیر کیا۔ توانائی تو یہ ایک ہی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اس کی حیثیت دو طرح سے بیان کی گئی ہے، نوعِ انسانی کو مجموعی طور پر مل جانے کے پیچھے یہ روح کے لفظ سے تعبیر نہیں ہوئی بلکہ اس کے لئے قرآنِ کریم نفس کا لفظ استعمال کرتا ہے عام طور پر لوگ انسان کو ''جسم اور روح'' کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ لیکن قرآنِ کریم انسان کو ''جسم اور نفس'' کا مجموعہ گردانتا ہے۔ قرآنِ کریم روحِ خداوندی کا قائل ہے لیکن وہ روحِ انسان کا قائل نہیں ہے۔

قرآنِ کریم ذات یا نفس انسانی کی تربیت اور اس کی پرورش کرنے کو انسانی زندگی کا مقصد قرار دیتا ہے۔ قرآنِ کریم چونکہ روحِ انسانی کا قائل ہی نہیں اس لئے اس نے روحِ انسانی کی تربیت کا کوئی ذکر نہیں کیا، نہ اس کے لئے کوئی اصول بیان کئے۔ قرآنِ کریم نفسِ انسانی کا قائل ہے اور اس نے نفس کی تربیت اور اس کی پرورش کے طریقے بیان کر دیئے ہیں اور یہ بھی واضح کر دیا کہ نفسِ انسانی کی پرورش صرف ان طریقوں سے ہو سکتی ہے جو خود قرآنِ کریم نے بیان کر دیئے ہیں ان اصولوں کے علاوہ اور کسی اصول کے ذریعے نفسِ انسانی کی پرورش نہیں ہو سکتی (4:49)۔

ہمارے علماء نفس کی بجائے روح انسانی کے قائل ہیں۔ جس کی تربیت اور پرورش، پرستش کے ذریعہ کی جاتی ہے۔ پرستش ہر جگہ، اور کسی بھی جگہ ہو سکتی ہے۔ اس پرورش کے لئے ہمارے علماء کسی نظام کی ضرورت محسوس نہیں کرتے ان کے نزدیک سعودی عرب میں رہنا اور ہندوستان میں رہنا برابر ہے۔ یہ علماء چونکہ کسی نظام کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، اس لئے خلافتِ راشدہ کے بعد سے کہیں بھی ریاستِ مدینہ قائم نہیں ہو سکی۔ قرآنِ کریم میں نہ روحانیت کا لفظ آیا ہے اور نہ ہی معرفت کا۔ قرآنِ کریم ان دونوں تصورات سے بہت بلند ہے۔ وہ ان کے حاصل کرنے کا کوئی حکم نہیں دیتا۔ جب تک مسلمان روحِ انسانی، روحانیت اور معرفت کا عقیدہ برقرار رکھیں گے۔ اُس وقت تک وہ ریاستِ مدینہ قائم نہیں کر سکیں گے۔

یہ بات واضح رہے کہ قرآنِ کریم میں روحِ انسانی کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔ ہم مسلمانوں میں یہ عقیدہ وضعی اور بے بنیاد روایات کے ذریعے مروج ہے۔ اس سلسلہ میں آپ چند روایات ملاحظہ فرمائیں۔

(1) حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب اللہ نے آدم کو پیدا کیا تو اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا پس اس کی پشت سے ارواح گریں جن کا خالق اللہ ہے۔ آدم کی پشت سے اولاد سے قیامت کے دن تک۔

(مشکوٰۃ شریف، باب الایمان)

(2) مسلم بن یسار سے روایت ہے کہ آیت وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ (7:172) کے متعلق حضرت عمرؓ سے دریافت کیا گیا۔ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ جب ان سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ تحقیق اللہ نے آدمی کو پیدا کیا تھا پھر اس کی پشت پر دایاں ہاتھ پھیرا پس اس کی پشت سے اس کی اولاد نکلی۔

(مشکوٰۃ، باب الایمان)

(3) حضرت ابوداؤد، حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں انہوں نے فرمایا کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا پس اس کے دائیں شانہ پر ہاتھ پھیرا تو مورچہ جیسی نورانی اولاد نکلی۔

(ترمذی، ابوداؤد)

یہ تین احادیث آپ نے ملاحظہ فرمائیں۔ اسی مضمون کی کافی احادیث دیگر کتب میں موجود ہیں۔ علماء کرام کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب دنیا کو پیدا کیا تو پہلے تو آدم کو پیدا کیا اور اس کی پشت سے کڑوڑوں ارواح نکالیں وہ ارواح اب اربوں کی تعداد میں عالم ارواح میں موجود ہیں۔ جب کوئی نطفہ جنین کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اور 4 ماہ کا ہو جاتا ہے تو اس ذخیرۂ ارواح سے ایک روح کو لیکر اس جنین میں ڈال دیا جاتا ہے، تو اس جنین میں زندگی دوڑ جاتی ہے۔ لیکن علماء کا یہ نظریہ بدیہی طور پر غلط ہے کیونکہ انسانی نطفہ تو شروع سے ہی زندہ ہوتا ہے۔ یہ تصور کہ 4 ماہ بعد روح کے ڈالے جانے کے بعد وہ زندہ ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر غلط ہے۔

قرآنِ کریم روحِ انسانی کی بجائے، نفس انسانی کا تصور پیش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توانائی کو نفس کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اور اس کے حاصل ہونے کے بعد انسان صاحبِ اختیار و ارادہ ہو جاتا ہے۔ اور اپنے کاموں کے لئے جوابدہ ہے (2:286) ان احکامات کے خلاف چلنے سے اس میں کمزوری واضمحلال واقع ہوتا ہے (4:111) اگر اس ذات کو مستحکم کر لیا جائے تو یہ ذات، انسانی جسم کی موت سے مرتی نہیں۔ یہ زندہ رہتی ہے، اور اعلیٰ مراتب پر فائز ہوتی جاتی ہے۔ اسی کو جنت میں جانا کہتے ہیں۔ انسان کے جسم کے مرنے کے بعد یہ زندگی اگلی کڑیوں میں منتقل ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی لئے ہماری اس دور کی انسانیت زندگی کی آخری کڑی نہیں ہے۔ اس کو استحکام صرف اسلام کے نظام میں ملتا ہے۔ اس لئے ریاست مدینہ کا قائم کرنا ضروری ہے۔ اس کے قیام کے بغیر مقصد زندگی پورا نہیں ہوتا۔

قرآنِ کریم نفس انسانی کا قائل ہے، لیکن بالکل اس کے برخلاف ہمارے علماء کرام روح انسانی اور روحانیت کے قائل ہیں۔ ہمارے علماء روح اور روحانیت کو پرستش کے ذریعے ترقی دیتے ہیں۔ جبکہ قرآنِ کریم نفس انسانی کو اطاعت خداوندی کے ذریعہ ترقی دیتا ہے جو صرف اور صرف ریاست مدینہ میں کی جاسکتی ہے چونکہ روح کی ترقی پرستش کے ذریعہ ہوتی ہے، جو ہر جگہ اور ہر نظام میں ہوسکتی ہے، اس لئے ہمارے علماء کو ''ریاستِ مدینہ'' کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اسی لئے خلافتِ راشدہ کے بعد سے کہیں بھی ریاستِ مدینہ قائم نہیں ہوسکی۔ لیکن جو حضرات قرآنِ خالص پر عمل کرتے ہیں اور وہ نفس انسانی کی پرورش کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے لئے پرستش کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ان کے لئے صرف اقامتِ دین کے لئے کوشش کی راہ ہی باقی رہ جاتی ہے۔ تجدید یادداشت کے لئے عرض ہے کہ اب تک جو تحریر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ روحِ انسانی، روحانیت اور معرفتِ خداوندی میں Believe کرنے والوں کو ریاست مدینہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ریاست مدینہ کی ضرورت صرف ان لوگوں کو ہوتی ہے جو روحِ انسانی، اور روحانیت کے عقیدہ کو Condemn کرتے ہیں۔ اور نفس انسانی کی پرورش کرنے کے قائل ہیں۔ اسی لئے ریاست مدینہ کے قیام کے بارے میں علماء سے مشورہ لینا مناسب اِقدام نہیں ہے جو خود ہی ریاست مدینہ کے قائل نہیں ہیں۔ ریاستِ مدینہ ان کی ترجیحات میں نہیں ہے۔

اسی وجہ سے ہمارے علماء نے قیام پاکستان کی ڈٹ کے مخالفت کی تھی۔ وہ صرف، سیکولر ریاست کے قائل ہیں۔ ان علماء میں سے چند علماء اور ان کے شاگرد پاکستان آگئے تھے۔ پاکستان آنے والے علماء ان ہی علماء کے شاگرد تھے جو قیامِ پاکستان کے خلاف تھے۔ اور جنہوں نے قیامِ پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ دونوں طرف کے علماء روحانیت کے قائل ہیں۔ جنہیں اسلامی نظام سے کوئی تعلق نہیں۔ وہی قرآن وحدیث ہندوستان کے علماء کے پاس تھی اور وہی قرآن وحدیث پاکستانی علماء کے سامنے ہے۔ لیکن حیرانی یہ ہے کہ پاکستان آنے والے علماء نے نفاذ شریعت کا مطالبہ کردیا۔ یہ پاکستانی علماء اسلامی نظام کا مطالبہ نہیں کرتے، یہ نفاذ شریعت کا مطالبہ کرتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے، اس کو سمجھنے کے لئے پہلے آپ شریعت پر غور فرمائیں کہ شریعت کیا ہوتی ہے۔

حضور ﷺ نے جب ریاست مدینہ قائم فرمائی تھی تو وہ دس لاکھ مربع میل کے رقبہ پر مشتمل تھی۔ حضور ﷺ خود اتنی وسیع حکومت کو تن تنہا نہیں چلا سکتے تھے، اس لئے حضور نے اپنی مدد کے لئے جگہ بہ جگہ مقامی حکام تعینات کردیئے تھے جن کو قرآنِ کریم نے اولی الامر کے نام سے موسوم کیا۔ سمجھنے کے لئے آپ اُن کو موجودہ دور کے DC یا SP کے مترادف سمجھ لیں۔ قرآنِ کریم نے ان کی اطاعت کو بھی فرض قرار دیا (4:59) جب دو اشخاص یا دو پارٹیوں کے درمیان تنازعہ ہوتا تھا تو وہ لوگ مقامی حکام سے اپنے تنازعہ کا فیصلہ کرالیتے تھے۔ مقامی حکام کے فیصلہ کی اطاعت رسول اللہ ﷺ کے فیصلے کی اطاعت کے مترادف تھی۔ مقامی حکام کی اطاعت کو فرض قرار دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی ذاتی اطاعت کا تصور ختم ہوگیا۔ اب رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ان کے منصب کی اطاعت تھی ان کی ذاتی اطاعت نہیں تھی۔

حضور ﷺ کو بذریعہ وحی جو احکامات ملتے تھے زیادہ تر وہ اصول کی صورت میں ہوتے تھے۔ حضور ﷺ ان اصولوں کی جزئیات خود مقرر فرماتے تھے۔ قرآن نے مسافر کے لئے حکم دیا کہ وہ رمضان کے بعد روزہ رکھ سکتے ہیں۔ لیکن سفر کا تعین نہیں کیا۔ قرآنِ کریم نے چوری کی سزا ہاتھ قطعِ ید بیان کی لیکن نہ چوری کی رقم کو بیان کیا اور نہ ہاتھ کاٹنے کی وضاحت کی۔ حضور ﷺ نے خود جزئیات مقرر فرمائیں۔ حضور ﷺ ان جزئیات کو implement کرتے تھے، اسلامی نظام جس میں قرآن کے احکامات جاری ہوتے ہیں اور جس میں اولی الامر یعنی مقامی احکام کی اطاعت فرض ہوتی ہے اس کی جزئیات شریعتِ اسلامی ہوتی ہے۔ غیر اسلامی ریاست کے احکام، جس میں مقامی حکام کی اطاعت فرض نہیں ہوتی اس کے احکام کی جزئیات شریعتِ اسلامی نہیں ہوسکتی۔ ہماری موجودہ شریعت جس کی کتابیں ہمارے علماء کرام اپنے کندھوں پر اٹھائے لئے لئے پھرتے ہیں یہ شریعت بنوعباس کے دور میں وضع ہوئی تھی۔ بنوعباس کی حکومت غیر اسلامی ملوکیت تھی۔ بنوعباس کے خلفاء کے ہاں دو، تین، تین ہزار خواتین حرم میں ہوتی تھیں۔ یہ شریعت اس دور کے علماء کی ذاتی آراء پر مشتمل ہے۔ یہ حضرات اس ایک ہزار سال پیشتر کی وضع کردہ شریعت کے ماہر ہوتے ہیں۔ ہمارے موجودہ دور کے وکلاء، برسٹرز، جج صاحبان اس کے ماہر نہیں ہوتے۔ مملکت میں شریعت کے نفاذ سے مولوی صاحبان کی value بڑھ جاتی ہے اس لئے یہ حضرات شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ان کا اقامتِ دین یا ریاستِ مدینہ سے کوئی لینا دینا نہیں۔

جماعتِ اسلامی، اور ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کی تنظیمِ اسلامی، اور بین الاقوامی شہرت کی مالک، مصر کی اخوان المسلمون کی عجیب پوزیشن ہے۔ ہمارے ذہن میں جماعتِ اسلامی اور تنظیم اسلامی کے ارکان کی بہت عزت اور محبت ہے کہ چودہ سو سال بعد انہوں نے کم سے کم اقامتِ دین کا نعرہ تو بلند کیا ہے۔ ان میں سے بہت بڑی تعداد سے ہمارے ذاتی مراسم اور محبتیں بھی رہی ہیں۔ ان جماعتوں کے جو ارکان اقامتِ دین کی کوشش کر رہے ہیں ہماری دعائیں ان کے ساتھ ہیں اور جو حضرات گذر گئے ان کے اعلیٰ درجات کی دعا ہماری طرف سے ہے۔ یہ تینوں جماعتیں اقامت دین کی داعی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ روحانیت اور پرستش کی بھی قائل ہیں۔ پرستش کو ہی اپنا ذریعہ نجات گردانتی ہیں اور اسلامی ریاست کی اطاعت کو عبادت خداوندی شمار نہیں کرتیں۔ تحریکِ طلوعِ اسلام، قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق پرستش کو Condemn کرتی ہے اور اس کو اقامت دین میں ایک رکاوٹ سمجھتی ہے۔ یہ تحریک حقیقی ریاستِ مدینہ کی اطاعت کو عبادتِ خداوندی سمجھتی ہے۔ جب تک آپ ریاستِ مدینہ کی اطاعت کو عبادتِ خداوندی قرار نہیں دیں گے، مسلمان پرستش ہی کرتے رہیں گے اور گریز کی راہیں کھلی رہیں گی۔

ہمیں مولانا مودودیؒ صاحب مرحوم کا بہت احترام ہے۔ لیکن اس معاملہ میں ان کی پوزیشن قرآن کے مطابق نہیں ہے۔ ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں''، ان کی مشہور علمی کتاب ہے اس میں انہوں نے تحریر فرمایا ہے۔ ''حکومت اگر اللہ کے قانون پر مبنی ہے اور اس کا حکم جاری کرتی ہے تو اس کی اطاعت فرض ہے اور اگر ایسی نہیں ہے تو اس کی اطاعت جرم ہے

(صفحہ:91)، محترم جناب مودودی صاحب مرحوم نے یہ بات بالکل درست تحریر کی ہے۔ انہوں نے اس بارے میں آیت کا حوالہ نہیں دیا ہم اس بارے میں متعلقہ آیت کا اضافہ کرتے ہیں۔ یہ آیۂ مبارکہ سورہ الانعام کی 123 نمبر ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنے والا ہر شخص مجرم ہوتا ہے اور ان کے لیڈر ''اَکٰبِرَ مُجْرِمِیْھَا'' ہوتے ہیں۔

ہمیں حیرانی ہے اس بات پر کہ جب حضرت مولانا مرحوم اسلامی نظام کی اطاعت کو فرض قرار دے رہے ہیں اور غیر اسلامی ریاست کی اطاعت کو جرم قرار دے رہے ہیں تو پھر وہ اسلامی ریاست کی اطاعت کو عبادتِ خداوندی کیوں نہیں تسلیم کرتے۔ جب سیکولر نظام کی اطاعت جرم ہے تو اس کا لازمی و منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلامی نظام کی اطاعت عبادتِ خداوندی ہوتی ہے۔ لیکن مولانا مرحوم اس نتیجہ پر نہیں پہنچتے۔

جب قرآنِ کریم نے اولوالامر کی اطاعت کو فرض قرار دیا ہے (4:59) تو یہ لازمی بات ہے کہ ''ریاستِ مدینہ'' کی مقامی عدالتوں کے مقامی تھانوں، تحصیلوں کے احکامات کی اطاعت بھی فرض ہوتی ہے اور بہ منزلہ عبادتِ خداوندی ہوگی۔ یہ سارے ادارے جہاں سے احکاماتِ خداوندی جاری ہوتے ہیں۔ یہ سب مساجد اللہ ہوں گے۔ اس ریاست کا جھنڈا اس کا پرچم اس کا قومی ترانہ، اس کا پاسپورٹ، اس کی کرنسی یہ سب شعائر اللہ ہوں گے۔ اس کے افسران اور اس کے ارباب اقتدار حاملین عرشِ الٰہی ہوتے ہیں (40:7) اس ریاست کے ایک ایک حکم کی اطاعت عبادتِ خداوندی ہوگی۔ قرآنِ کریم نے کہا کہ جب تم کسی کو قرضہ دو یا کوئی لین دین کرو تو اس کو تحریر کرلیا کرو (2:283)، جب آپ اس حکم کی اطاعت کرتے ہیں اور لین دین کے معاملہ کو تحریر میں لاتے ہیں، تو آپ اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ قرآن نے حکم دیا کہ دوسروں سے ملنے جاؤ تو By Appointment جاؤ (24:27) جب آپ اس حکم کی اطاعت کرتے ہیں اور اطلاع کرتے اور اجازت لے کر دوسروں کے گھر میں داخل ہوتے ہیں تو آپ اطاعتِ خداوندی کرتے ہیں۔ جب آپ ٹریفک سگنل پر آگے جاتے یا رُک جاتے ہیں تو ''ریاستِ مدینہ'' میں یہ بھی عبادتِ خداوندی شمار ہوگی، جب تک آپ ہر طرح کی پرستش کو ترک کر کے، ریاستِ مدینہ کی اطاعت کو عبادتِ خداوندی قرار نہیں دیں گے ریاستِ مدینہ قائم کرنے میں آپ کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس ریاست مدینہ کے ہر حکم کی اطاعت سے نفسِ انسانی میں بالیدگی اور نشوونما حاصل ہوتی ہے۔ جبکہ سیکولر ریاست کے ہر حکم کی اطاعت جرم ہوتی ہے اور اس کے احکام کی اطاعت سے نفس انسانی کمزور اور مضمحل ہوتی ہے۔ چونکہ انسانی زندگی کا مقصد نفس انسانی کی نشوونما کرنا ہوتا ہے اس لئے ریاست مدینہ کو قائم کرنا، ہر مسلمان کا فرض ہوتا ہے (42:13)۔

(1) مکافاتِ عمل:

ریاستِ مدینہ قائم کرنے والوں کے لئے ذات یا نفس انسانی پر ایمان لانا فرض ہے۔ اس کے علاوہ ان کو مکافات عمل پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ مکافاتِ عمل کا مفہوم یہ ہے کہ ہر کام اپنا نتیجہ ضرور بالضرور مرتب کرتا ہے۔ خارجی دنیا تو خود ہی

قانونِ خداوندی کے مطابق عمل کرنے پر مجبور ہے اس کا نتیجہ تو از خود برآمد ہوتا رہتا ہے۔ سائنس کی دنیا میں اس کو Cause and effect کہتے ہیں۔ لیکن انسان کو اللہ تعالیٰ نے اختیار و ارادہ عطا کیا ہے اور اس کو اس کے ہر فعل کا ذمہ دار قرار دیا ہے اس لئے یہ اللہ تعالیٰ کے قوانین کے مطابق بھی کام کر سکتا ہے اور قوانین خداوندی کے خلاف بھی کام کر سکتا ہے۔ جب کوئی انسان قانونِ خداوندی کے مطابق کام کرتا ہے تو اس کی ذات میں نشوونما ہوتی ہے (2:286)، اور جب یہ قانونِ خداوندی کے خلاف کام کرتا ہے تو اس کی ذات میں کمزوری اور اضمحلال واقع ہو جاتا ہے (4:111)، ہر قوم اور ہر معاشرہ افراد کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جس قوم کے افراد اپنی ذات کو نشوونما دینے کے لئے قوانین خداوندی کا اتباع کرتے ہیں، وہ قوم بلند مقام بھی حاصل کر لیتی ہے اور جس قوم کے افراد اپنی ذات کی نشوونما کرنے کی پروا نہیں کرتے، اور جرائم کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں وہ قوم پستی کا شکار ہو جاتی ہے۔

(2) مستقل اقدار:

ذات انسانی کو مستحکم کرنے اور معاشرہ کو مرفہ الحال بنانے کے لئے مستقل اقدار اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآنِ کریم میں نازل کی گئیں۔ معاشرہ کو چلانے کے یہ اصول غیر متبدل ہیں۔ اس لئے ان کو مستقل اقدار کہا گیا ہے۔ عقل انسانی مستقل اقدار وضع نہیں کر سکتی۔ مسلمانوں کے علاوہ کسی قوم یا کسی ملک میں مستقل اقدار کا تصور ہی نہیں ہے۔ سیکولر حکومتوں میں تو مستقل کیا عارضی اقدار بھی نہیں ہوتیں۔ ان کے ہاں تو قدر کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ ان کی واحد قدر اپنا مفاد، دولت لوٹنا، اور سرمایہ پرستی ہوتا ہے۔ مستقل اقدار پر عمل کرنے سے، ذات انسانی کی، نشوونما ہوتی ہے۔ اصل میں یہ اقدار انسانی ذات کی خصوصیات ہوتی ہیں۔ ہر قدر پر عمل کرنے سے ذات کی نشوونما ہوتی ہے اور اس کا By Product یہ ہوتا ہے کہ ''ریاست مدینہ'' کا بھی تزکیہ ساتھ ساتھ ہوتا چلتا ہے۔ ذات کی نشوونما ایک مستقل قدر ہے کہ:

الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰىۚ (92:18)،

جو شخص اپنا مال دوسروں پر صرف کرتا ہے اس کی نفس میں تزکیہ ہوتا ہے، اس معاشرہ میں دوسروں کی پرورش سے اپنی پرورش ہوتی ہے۔ دوسروں کی ربوبیت کرنے سے ذات مستحکم ہوتی ہے۔ اس معاشرہ میں ہر شخص دوسرے کی ربوبیت کرتا ہے۔ مثلاً ایک مستقل قدر عدل کرنا ہے۔ عدل کرنے سے ذات میں استحکام ہوتا ہے، اس طرح معاشرہ میں ہر شخص کو عدل مل جاتا ہے ہر قدر جہاں نفس کو مضبوط کرتی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے ریاستِ مدینہ بہتر سے بہتر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہم نے اپنے متعدد مضامین میں مستقل اقدار کی بڑی وضاحت تحریر کی ہے کہ یہ مستقل اقدار ذات اور معاشرہ کو برابر مزکیٰ کرتی چلی جاتی ہیں۔ اس مقام پر بقدرِ ضرورت، بلکہ ضرورت سے زیادہ وضاحت پیشِ خدمت عالی کر دی گئی ہے۔

(3) صفاتِ خداوندی:

حیوانی زندگی اور انسانی زندگی میں یہ فرق ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے، ایک ذات عنایت فرمائی ہے۔ ''نفخ روح''

قرآنِ کریم کی ایک اصطلاح ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ذات میں اپنی ساری صفات کی امکانی صلاحیتیں منتقل کردی ہیں۔ اب نفخ روح کے بعد انسان ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت، کرم، رحم، ستار، غفوران تمام صفات پر عمل کرسکتا ہے۔ انسان کی زندگی کا مقصد اپنی ذات کو نشوونما دینا ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنے اندر پیدا کرتا جائے جس قدر صفاتِ خداوندی انسان میں پیدا ہوں گی، اسی قدر اس کو تقربِ خداوندی ہوتا چلا جائے گا۔ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ ذاتِ باری تعالیٰ کو اپنے سامنے بطور ماڈل رکھے، اور ان صفات کو اپنے میں منعکس کرتا چلا جائے۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی ذات ایک ماڈل ہوتی ہے اور وہ صفات ہمارے لئے ماڈل ہوتی ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ قرآن کے فوائد میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم نے تحریر فرمایا ہے ''جب حکمت الٰہی مقتضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کا مظاہرہ کرتے تو اس نے اس عالم کو پیدا کیا۔ زمین، آسمان کی تخلیق اور ان کے کُل نظم ونسق سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور علم محیط وغیرہ صفات کی لوگوں کو معرفت ہو۔ تخلیق عالم سے یہ غرض جب ہی پوری ہوسکتی ہے کہ مخلوقات میں اس کی ہر قسم کی صفات کا اظہار ہو۔ ہم مولانا کا پورا اقتباس نقل نہیں کررہے۔ ہماری غرض صرف یہ ہے کہ مولانا کی تائید حاصل ہوجائے۔ صفاتِ خداوندی کا موضوع بہت دلچسپ، مشکل اور وسیع ہے۔ ہم نے صرف بقدرِ ضرورت تحریر کیا ہے۔

(4) عبادت کا قرآنی تصور:

ہم نے اپنے متعدد مضامین میں، قرآنی آیات کے دلائل کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ قرآنِ کریم نے عبادت کے معنی محکومی کے بیان کئے ہیں۔ عبید کے معنی غلام اور محکوم کے ہیں۔ پرستندہ کے نہیں ہیں۔ ریاستِ مدینہ کی اساس ہی یہ ہے کہ قوانین خداوندی کے علاوہ کسی اور کی محکومی جائز نہیں ہے۔ اس کا نام عبادتِ خداوندی ہے۔ پرستش کا تصور قرآنی نہیں ہے۔ پرستش مذہب میں ہوتی ہے اس کے نتائج مرنے کے بعد برآمد ہوتے ہیں۔ دین میں اطاعتِ خداوندی ہوتی ہے۔ اس کے نتائج اسی دنیا میں برآمد ہوتے ہیں قرآنِ کریم نے اطاعت کو معروف کہا ہے طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ط (24:53)، اطاعتِ معروف ہوتی ہے۔ اس کے نتائج معلوم ہوتے ہیں۔ عبادت کے اس معنی کو پیشِ نظر رکھیں اور پھر قرآنِ کریم کی اس آیۂ کریمہ کو مطالعہ فرمائیں ارشاد ہوتا ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ (51:56) ترجمہ: ہم نے بدوی اور شہری لوگوں کو اپنی محکومی کے لئے پیدا کیا ہے۔ قرآن کریم کے نزدیک تخلیق انسانی کی غرض وغایت ہی یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی محکومیت میں رہے۔ ہمارے علماء اس کا ترجمہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس لئے پیدا کیا تاکہ انسان اللہ کی پرستش کریں۔ لیکن آپ غور فرمائیں کہ پرستش ہر وقت نہیں ہوسکتی۔ ایک انسان نمازیں پڑھ لیتا ہے۔ نوافل پڑھ لیتا ہے۔ اس سے باقی وقت جو وہ گزارے گا وہ مقصد تخلیق انسانی کے خلاف ہوگا کیونکہ چوبیس گھنٹے کوئی آدمی پرستش نہیں کرسکتا۔ ہمارے علماء اپنے بزرگوں

کے لئے یہی بات مشہور کرتے ہیں کہ فلاں حضرت صاحب دن رات پرستش میں لگے رہتے تھے۔ نفلیں پڑھتے رہتے تھے۔ تسبیحات پڑھتے رہتے۔ وہ قائم الیل وصائم النہار تھے۔ لیکن پھر بھی بات بنائے نہیں بنتی۔ قرآنِ کریم نے تو فرمایا:

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (45:13)

ترجمہ: ساری کائنات تمہاری تسخیر کردی گئی ہے۔ تم ان تمام قوتوں پر قبضہ کرو۔ اس سے خود بھی فائدہ اٹھاؤ۔ پوری انسانیت کو بھی ان فوائد میں شامل Share کرو۔

ایک گوشہ میں بیٹھے، نمازیں، نفلیں، تہجد، اعتکاف اور ادو وظائف پڑھ کر تسخیر کائنات سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ محکومی اور پرستش کے درمیان فرق نہ کرنے کی وجہ سے ہی مسلمان غارت و برباد ہوئے ہیں۔ پرستش کا خود ایک Charm ہوتا ہے۔ مسلمانوں سے اس بات کی توقع کرنا کہ وہ پرستش ترک کردیں مشکل بات ہے۔ اسی لئے ریاستِ مدینہ کی تشکیل کے Chances بھی بہت کم رہے ہیں۔

اب ہم ریاستِ مدینہ قائم کرنے کے عملی اقدامات تحریر کررہے ہیں۔

سب سے پہلے یہ کوشش کی جائے کہ ہم نے جو نظریات تحریر کئے ہیں وہ عوام میں مقبول ہوجائیں۔ روحانیت کو Condemn کرکے ذاتِ انسانی کے تصور کو پھیلایا جائے۔ اطاعت اور پرستش کے فرق کو واضح کیا جائے۔ اطاعتِ خداوندی کے فوائد اور پرستش کے نقصانات کو واضح کیا جائے اگر پچیس تیس فیصدی لوگ بھی ان نظریات کو قبول کرلیں تو ریاستِ مدینہ کے قیام کے امکانات پیدا ہوجاتے ہیں، لیکن جب سربراہِ مملکت ہی معرفت کے راستے پر گامزن ہوں تو پھر ریاستِ مدینہ قائم نہیں ہوسکتی۔

شروع میں ریاستِ مدینہ میں مستقل اقدار کو نافذ کیا جائے، ریاستِ مدینہ کا دستور قرآن ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کے سامنے ریاستِ مدینہ کو چلانے کے لئے صرف قرآن سامنے تھا۔ فی الحال حکومت کا ڈھانچہ یہی رکھیں۔ رفتہ رفتہ قرآنی قوانین جاری کرتے جائیں۔ اس میں مولوی صاحبان کی کوئی اجارہ داری نہیں ہوگی۔ فرقہ بندی مذہب میں ہوتی ہے دین میں فرقہ بندی نہیں ہوتی۔ ریاستِ مدینہ جو احکامات نافذ کرتی ہے ان کا سب پر اطلاق ہوتا ہے۔ ریاستِ مدینہ میں پبلک اور پرائیویٹ قانون کی تفریق نہیں ہوتی۔ پیچھے منہ کرکے بالکل نہ دیکھیں۔ مسلمانوں کا ماضی بالکل تاریک ہے، صرف آگے کی طرف رخ رکھیں۔ نیتِ خالص رکھیں اور قرآنِ خالص کو مضبوطی سے پکڑے رہیں۔

زمین اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے۔ یہ انسان کی پیدائش سے پیشتر سے موجود تھی۔ آپ پیچھے چلتے جائیں۔ سینکڑوں سال پہلے زمین پر ان لوگوں نے قبضہ کیا جو اس وقت طاقتور رہیں۔ قرآنِ کریم کی رو سے ملکیتِ زمین بالکل

حرام ہے۔ ساری زمین حکومت کی تحویل میں رکھیں تا کہ ریاست ہر شہری کی ہر ضرورت پوری کر سکے۔

عدل انسانوں کا پیدائشی حق ہے۔ ہر ایک کی صلاحیتوں کی نشوونما کے یکساں مواقع فراہم کرنا عدل ہے۔ ہر شخص کے واجبات بروقت ادا کرنا عدل ہے۔ تمام امور کے فیصلے قرآن کے مطابق کرنا عدل ہے۔ جو لوگ تمہارے دشمن ہیں ان سے بھی عدل کرنا ضروری ہے۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ (5:8)

ترجمہ: ہر ایک کے مدارج اس کے اعمال کے مطابق متعین ہوں گے، جو سب سے زیادہ ریاستِ مدینہ کی اطاعت کرے گا وہ سب سے زیادہ واجب الاحترام ہوگا۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ (49:13)۔

ریاستِ مدینہ کے لئے ضروری ہے کہ معاملات اہل لوگوں کے سپرد کئے جائیں۔ نااہل لوگوں کے سپرد معاملات نہ کئے جائیں (4:58)۔

ریاستِ مدینہ میں سیاست عبادتِ خداوندی ہوتی ہے۔ سیکولر حکومتیں عوام کو جواب دہ ہوتی ہیں۔ ریاست مدینہ چونکہ اللہ تعالیٰ کے Behalf پر قائم ہوتی ہے اور اس کے Behalf پر ہی وعدے کرتی ہے اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کو ہی جوابدہ ہوتی ہے وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْـُٔوْلًا (33:15) اس ریاست نے تمام وعدے ہمارے Behalf پر کئے تھے۔ ہم سوال کریں گے کہ ان معاہدوں کا کیا ہوا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر ایک کتیا بھی دجلہ کے کنارے بھوکی مر گئی تو اس کے بارے میں مجھ سے سوال ہوگا۔

آخر میں ہماری عمران خان صاحب سے گذارش ہے کہ وہ مزعومہ/ممکنہ ''ریاستِ مدینہ'' کے وزیراعظم ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری کا احساس کریں۔ تقریباً تیرہ سو سال بعد بھی کوئی اس کی تعمیر کی جرأت نہیں کر سکا۔ وہ روحانیت اور معرفت کی دل فریب چال سے باہر نکلیں، آج کل جو وہ بڑے بڑے علماء کرام سے اس بارے میں مشورے کر رہے ہیں ان کو ترک کریں۔ قرآنِ خالص سامنے رکھیں اور قرآن کی ہدایات کے مطابق اس ریاست کی تعمیر کے لئے کوشش کریں۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ (29:69)

ترجمہ: اور جب لوگوں نے ہماری راہ میں کوشش کی ہم ضرور ان کو اپنی راہیں دکھاتے جائیں گے۔

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(قسط نمبر 32)

دو قومی قرآنی نظریہ پر مطالبۂ پاکستان

63۔ الرافع

اِس کے معنی اٹھانے اور بلند کرنے کے ہیں یہ کبھی تو مادی چیز جو اپنی جگہ پر پڑی ہوئی ہو اسے اس کی جگہ سے اٹھا کر بلند کرنے پر بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:

اَللّٰہُ الَّذِیۡ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَہَا (13:2)

مفہوم: ''اللہ وہ قادر مطلق ہے جس نے آسمان کو بغیر کسی سہارے کے اونچا بنا کھڑا کیا''۔

اور کبھی عمارت کو کھڑا کرنے اور اوپر لے جانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:

وَاِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰہٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ (2:127)

مفہوم: ''اور جب ابراہیم (علیہ السلام) خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے''۔

کبھی ناموری اور شہرت کا ذکر بلند کرنے کے لئے جیسے فرمایا:

وَرَفَعۡنَا لَکَ ذِکۡرَکَ ؕ (94:4)

مفہوم: ''اور ہم نے تمہارے ذکر خیر کو بلند کیا''۔

اور کبھی مرتبہ کی بلندی بیان کرنے کے لئے۔ جیسے فرمایا:

وَرَفَعَ بَعۡضَکُمۡ فَوۡقَ بَعۡضٍ دَرَجٰتٍ (6:165)

مفہوم: ''اور ان میں سے بعض کو بعض پر بلحاظ درجات کے فوقیت دی''

یہاں دونوں قسم کی بلندی کی طرف اشارہ ہے یعنی بلندی کی طرف لے جانے کی بلحاظ محل بلحاظ شرف و منزلت جماعتِ مومنین کی روش ہوتی ہے۔

64۔ الجلیل

اَلۡجَلَالَۃُ کے معنی ہیں عظیم القدر یعنی قدر و منزلت میں بڑا یعنی بلند مرتبہ ہونا کے ہیں اور (ۃ) کے بغیر اَلۡجَلَالِ کہا جائے تو

اس کے معنی ہوتے ہیں عظمت کی آخری حد جس کے بعد اور مرتبہ نہ ہو۔ اسی لیے یہ اللہ تعالیٰ کی وصف کے ساتھ مختص ہے۔ اور دوسروں کے حق میں استعمال نہیں ہوتا، چنانچہ اللہ کے متعلق قرآن پاک میں ہے:

ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۲۷﴾ (55:27)

مفہوم: ''صاحب جلال وعظمت''۔

مومنین کی اِسی صِفت کے قُربِ کے حصول میں کوشاں رہتے ہیں۔

65۔ الجمالُ:

یہ صِفت اللہ اور اُس کی ودیعت کردہ انسان میں بھی ہوتی ہے۔

جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ﴿۶﴾ (16:6)

مفہوم: ''جب تم مویشیوں کو صبح سویرے، باہر جنگل میں چرانے کے لئے لے جاتے ہو، یا شام میں انہیں چرا کر واپس لاتے ہو، تو یہ مناظر تمہارے لئے حسن و جمال کی کس قدر دل آویز کیفیتیں اپنے اندر لئے ہوتے ہیں''۔

خدا نے اپنی تخلیق میں حسن و جمال بھی رکھا تا کہ انسان کے جذبہ تحسینِ حسن کی تسکین ہو سکے۔

حیوانات کی زندگی کے لئے صرف طبیعی سامان زیست کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن انسان کے اندر تو ایک جذبہ ہوتا ہے، ایک خواہش ہوتی ہے، ایک آرزو ہوتی ہے، اور وہ بہت بڑی چیز ہے'' جذبہء تحسینِ حسن'' یعنی جمالیاتی پہلو بھی انسان کے اندر ہوتا ہے۔

66۔ المعز:

اَلْعِزَّةُ: اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان کو مغلوب ہونے سے محفوظ رکھے۔ قرآن پاک میں ہے:

اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾ (4:139)

مفہوم: ''کیا یہ ان کے ہاں عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ عزت تو سب خدا ہی کی ہے''۔

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (63:8)

مفہوم: ''عزت خدا کی ہے اور اس کے رسول ﷺ کی اور مومنوں کی''۔

67۔ المُحی:

اَلْحَيَاةُ: امام راغب نے اِس کے معانی بتائے ہیں کہ زندگی، جینا یہ اصل میں قوت نامیہ ہے جو حیوانات اور نباتات دونوں میں پائی جاتی ہے۔ اسی معنیٰ کے لحاظ سے نبات کو حَیٌّ یعنی زندہ کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ (57:17)

مفہوم: ''جان رکھو کہ خدا ہی زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے''۔

اور آیت کریمہ:

يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ (30:19)

مفہوم: ''وہی زندے کو مردے سے نکالتا ہے اور (وہی) مردے کو زندہ سے نکالتا ہے''۔

امام راغب نے الحی کے مزید یہ معانی بھی بتائے ہیں کہ:

قوت عاقلہ عاملہ (سوچنے اور عمل کرنے کی قوت) کا عطا کرنا مراد ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

لَقَدْ اَسْمَعْتَ لَوْ نَادَيْتَ حَيًّا وَلٰكِنْ لَّا حَيَاةَ لِمَنْ تُنَادِيْ

مفہوم: ''اگر تو کسی زندہ کو پکارتا تو وہ سن لیتا۔ لیکن جس کو تم پکارتے رہے ہو اس میں زندگی نہیں ہے (یعنی عقل سے محروم ہے)''۔

غم کا دور ہونا مراد ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ (3:169)

مفہوم: ''جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مرے ہوئے نہ سمجھنا (وہ مرے ہوئے نہیں ہیں) بلکہ خدا کے نزدیک زندہ ہیں۔ شہدا کو اسی معنیٰ میں اَحْیَائٌ یعنی زندے کہا ہے کیونکہ وہ لذت و راحت (آرام و سکون) میں ہیں۔

حیات سے آخرت کی دائمی زندگی مراد ہوتی ہے جو کہ علم و عقل کی زندگی کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (8:24)

مفہوم: ''خدا اور اس کے رسول کا حکم قبول کرو جبکہ رسول خدا تمہیں ایسے کام کے لئے بلاتے ہیں جو تم کو زندگی (جاوداں یعنی ہمیشہ رہنے والی) بخشتا ہے''۔

مومنین کی دائمی زندگی قبولیت کی خواہش اِس بنا پر بھی ہوتی ہے اور وہ ایمان رکھتے ہیں کہ:

وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ (5:32)

مفہوم: ''اور جو اس کی زندگی کا موجب (سبب) ہوا تو گویا تمام لوگوں کی دائمی زندگی کا موجب (سبب) ہوا''۔

68۔ المنزل:

اَلنُّزُوْلُ: کے معنی بلند جگہ سے نیچے اترنا کے ہیں۔

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ (97:4)

مفہوم: ''اس میں روح الامین اور فرشتے ہر کام کے انتظام کے لئے اپنے پروردگار کے حکم سے اترتے ہیں''۔

وضاحت میں کہا کہ:

اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓى اَهْلِ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ (29:34)

مفہوم: ''ہم اس بستی کے رہنے والوں پر اس سبب سے کہ یہ بدکاری کرتے ہیں۔ آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں انعامات کے نازل کرنے کے متعلق فرمایا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ (18:1)

مفہوم: ''سب تعریف خدا ہی کو ہے جس نے اپنے بندے (محمدؐ) پر یہ کتاب نازل کی۔''

القرآن کی تعلیم جس جذبہ وشوق سے مومنین پیروی کرتے ہیں، اُس کا مقابلہ کرکے بتلایا گیا کہ:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ؕ (59:21)

مفہوم: ''اگر ہم یہ قرآن پاک کسی پہاڑ پر نازل کرتے ہیں میں نَزَّلْنَا کی بجائے اَنْزَلْنَا کا لفظ لاکر متنبہ کیا ہے کہ جو کتاب ہم نے تم پر رات میں نازل کی ہے اگر اسے پہاڑ پر ایک دفعہ بھی نازل کر دیتے تو تم اس کو دیکھتے کہ خدا کے خوف سے وہ دبا جاتا ہے''۔

69۔ القابض

اَلْقَبْضُ کے معنی کسی چیز کو پورے پنجے کے ساتھ پکڑنے کے ہیں اور استعارہ کے طور پر قبض کے معنی تیز دوڑنے کے بھی آتے ہیں اس لحاظ سے کہ گویا دوڑنے والا زمین سے کسی چیز کو پکڑتا ہے اور آیت کریمہ:

وَاللّٰهُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (2:245)

مفہوم: ''اللہ ہی کا قانون روزی کو تنگ اور کشادہ کرتا ہے اور اُس کی طرف تُم لوٹنے والے ہو''۔

اِسی لئے مومنین ہر وقت نگاہ میں رکھتے ہیں کہ:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی (20:124)

مفہوم: ''جو ہمارے قوانین سے اعراض برتے گا اس کی روزی تنگ ہو جائے گی، اور وہ قیامت کے دن بھی اندھا ہی اٹھے گا''۔

70۔ الھادی:

اَلْهِدَایَةُ کے معنی لطف وکرم کے ساتھ کسی کی رہنمائی کرنے کے ہیں اور ارشاد ہے:

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (20:50)

مفہوم: ''ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر مخلوق کو اس کی (خاص طرح کی) بناوٹ عطا فرمائی پھر (ان کی خاص اغراض پورا کرنے کی) راہ دکھائی''۔

اِس کی وضاحت میں فرمایا کہ:

وَمَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ؕ (39:37)

مفہوم: ''اور جس کو خدا ہدایت دے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں''۔

ہدایت وتعلیم دو باتوں کے بغیر نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی ایک یہ کہ معلم اپنی طرف سے کما حقہ سمجھانے کی کوشش کرے اور دوسرے یہ کہ متعلم استفادہ کرنے کی کوتاہی سے کام نہ لے اگر ہادی یا معلم اپنی طرف سے تعلیم میں پوری کوشش کرے۔ لہذا ہمیں ذہن میں رکھنا ہوگا کہ ہدایت اُسی کے لئے ہے جو متقی یعنی اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہے۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (2:2)

مفہوم: ''ہدایت متقین کے لئے ہے''۔

71۔ المعبدُ:

اَلْعُبُوْدِيَّةُ: کے معنی ہیں کسی کے سامنے انکساری ظاہر کرنا۔ اور ایسی ذات صرف ذات الٰہی ہی ہے۔ اسی لیے فرمایا:

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (17:23)

مفہوم: ''اس (اللہ) کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو''۔

لہٰذا قرآن کی رو سے جہاں اعْبُدُوا اللّٰهَ (36:16)، اللہ کی عبادت کا ذکر ہوگا، اس کے عملی طور پر یہی معنی ہوں گے، قوانین خداوندی کی برضا ورغبت اطاعت، جس کے نہایت منفعت بخش نتائج مرتب ہوں گے۔ قوانین خداوندی کی محکومیت اختیار کرنے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان کی ذات کی نشوونما ہو جائے، جس سے یہ مرنے کے بعد زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتی ہے۔ خدا کی، خود اختیار کردہ محکومی اختیار کرنا، درحقیقت انسان کا اپنے اوپر زندگی کی بلند مستقل اقدار کو از خود عائد کرنا ہوتا ہے۔ یہ خارج سے عائد کردہ پابندیاں نہیں ہوتیں، اور نہ ہی اس میں پرستش ہوتی ہے، جسے زمانہ قدیم کے انسان نے فطرت کی قوتوں سے ڈر کر اور انہیں خوش کرنے کے لئے اپنے ذہن سے وضع کیا تھا۔

72۔ المُقدمُ:

اَلْقَدَمُ: انسان کا پاؤں۔ جمع اَقْدَامٌ۔ قرآن پاک میں ہے۔

وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ (8:11)

مفہوم: ''اس سے تمہارے پاؤں جمائے رکھے''۔

اسی سے تقدم کا لفظ لیا گیا ہے جو کہ تاخر کی ضد ہے۔ قدم، حدث کی ضد ہے علمائے متکلمین (علم کلام کا ماہرین) اسے بطور صفت الٰہی کے استعمال کرتے ہیں امام راغب نے قرآن کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (49:1)

مفہوم: ''خدا اور اس کے رسول سے پہلے نہ بول اٹھا کرو''

اِس کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ لَا تُقَدِّمُوْا بمعنی لَا تَتَقَدَّمُوْا کے ہیں اور اس کے اصل معنی یہ ہیں۔ کہ قول وحکم میں پیغمبر سے سبقت نہ کرو بلکہ وہی کام کرو جس کا تمہیں حکم دیتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ کے مکرم بندوں سے بیان کرتے ہوئے فرمایا:

لَا یَسْبِقُوْنَہٗ بِالْقَوْلِ (21:27)

مفہوم: ''اس کے آگے بڑھ کر بول نہیں سکتے''۔

اور آیت کریمہ:

لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَۃً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ (7:34)

مفہوم: ''ایک گھڑی نہ پیچھے رہ سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں۔ کے معنی یہ ہیں کہ وہ تقدم و تاخر کا ارادہ بھی نہیں کر سکتے''۔

73۔ الباقی:

بقاء کے معنی ہیں، کسی چیز کا اپنی حالت پر برقرار رہنا، تغیر پذیر نہ ہونا۔ یہ لفظ فناء کی ضد ہے، جس کے معنی ہیں، تغیر پذیر ہو جانا۔ کائنات میں ہر شے تغیر پذیر ہے، لیکن خدا کی ذات تمام تر تغیرات سے بلند ہے۔ دیکھیئے سورالرحمن کی آیت میں ہے کہ:

کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ ﴿۲۶﴾ (55:26)

مفہوم: ''اس کائنات میں ہر شے تغیر پذیر ہے''۔ لیکن

وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ ﴿۲۷﴾ (55:27)

مفہوم: ''خدائے ذوالجلال والاکرام کی ذات، بقاء کی حالت میں تمام تر تغیرات سے ماوراء ہے''۔

اس سے یہ بھی مترشح ہوا کہ جس طرح اس کی ذات تغیر نا آشنا ہے، اسی طرح اس کی صفات (قانون) بھی تغیر نا آشنا ہیں۔ ان صفات یعنی قوانین کو مستقل اقدار بھی کہا جاتا ہے۔ جو اعمال خدا کے قانون یا اقدار کے مطابق سرزد نہ ہوں، ان کے نتائج بھی غیر متبدل ثمرات کے حامل نہیں ہوتے۔ اگر انسان، ان مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرتا چلا جائے، تو اس کی ذات میں ایسا استحکام پیدا ہو جاتا ہے، وہ تغیرات سے بلند ہو جاتی ہے، اور موت کے جھٹکے سے بھی اس کو کچھ فرق نہیں پڑتا۔ قرآن کریم میں ہے کہ

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَۃُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّکَ ثَوَابًا وَّخَیْرٌ اَمَلًا (18:46)

مفہوم: ''دولت، اولاد، انسان کی دنیاوی (طبیعی) زندگی یعنی حیوانی سطحِ زندگی کی زینت کی چیزیں ہیں۔ لیکن خدا کے نزدیک اعمالِ خیر، انسانی ذات کی نشوونما کی صورت میں، تغیرات سے ماوراء رہتے ہیں''۔

74۔ المانع:

امام راغب نے لکھا ہے کہ اَلْمَنْعُ: یہ عطا کی ضد ہے۔ رَجُلٌ مَانِعٌ وَمَنَّاعٌ: بخیل آدمی۔

قرآن پاک میں ایسی جماعت میں شامل ہونے سے روکا ہے جو۔

وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ﴿۷﴾ (107:7)

مفہوم: ''اور برتنے کی چیزیں عاریۃً نہیں دیتے''۔

مزید اِن میں بھی جو:

مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيبٍ ۙ (50:25)

مفہوم: ''جو مال میں بخل کرنے والا ہے''۔

المانع کے معنی حمایت اور حفاظت کرنے والے کے بھی آتے ہیں اسی سے مکان منیع کا محاورہ ہے جس کے معنی محفوظ مکان کے ہیں اور منع کے معنی حفاظت کرنے کے فُلَانٌ ذُوْ مَنَعَۃٍ وہ بلند مرتبہ اور محفوظ ہے کہ اس تک دشمنوں کی رسائی ناممکن ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ (4:141)

مفہوم: ''کیا ہم تم پر غالب نہیں تھے؟ اور تم کو مسلمانوں کے ہاتھ سے بچایا نہیں''؟

مزید یہ کہ:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ (2:114)

مفہوم: ''اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے۔ جو خدا کی مسجدوں سے منع کرے''۔

مومنین کی بھی اللہ ہی کی صِفت کی پیروی میں یہی روش ہونی چاہیے کہ وہ لوگوں کو بُرائیوں سے منع کر کے اُن کی حفاظت کا سامان پہنچاتے رہیں۔

75۔ الرشید:

اَلرَّشَدُ وَالرُّشْدُ: یہ غَیٌّ کی ضد ہے اور اللہ کی ہدایت کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے:

لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝ (2:186)

مفہوم: ''تا کہ وہ سیدھے رستے پر لگ جائیں''۔

مزید یہ بھی کہ:

قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ (2:256)

مفہوم: ''گمراہی سے ہدایت الگ ہو چکی''۔

یہاں اللہ کی طرف سے رُشد کے عطاء کئے جانے کا بھی ذکر کر دیا۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ (21:51)

مفہوم: ''اور ابراہیم علیہ السلام کو ہم نے شروع ہی سے فہم سلیم عطا کی تھی''۔

لہٰذا مومنین کا فریضہ ہے کہ وہ اللہ سے رُشد حاصل کر کے معاشرہ کے دوسرے افراد کو بھی فیضیاب کریں۔

76۔ الضارُ:

اَلضُّرُّ: کے معنی بدحالی کے ہیں اور الضارُ بدحالی دور کرنے والی ذات ہے جو اللہ ہی کی صِفت ہے۔

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖۤ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآىِٕمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَاۤ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲﴾ (10:12)

مفہوم: ''(سرکش) انسان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کھڑا، بیٹھا، لیٹا (ہر وقت) ہمیں پکارتا ہے۔ لیکن جب اس سے وہ مصیبت ٹل جاتی ہے، تو وہ اس طرح (ہمارے قوانین سے) منہ پھیر کر چل دیتا ہے، جیسے کہ اس نے ہمیں اپنی مصیبت میں پکارا ہی نہ تھا۔ جو لوگ ہمارے قانون کی حد سے باہر نکل جاتے ہیں، ان کے ذاتی مفادات، ان کو حسین اور خوشنما دکھاتے ہیں''۔

لہٰذا مومنین کی صِفت ہوتی ہے کہ وہ ضرر اور عافیت دونوں میں اللہ ہی کے قوانین کی مدد سے اپنا بچاؤ کرتے ہیں۔

77۔ الوارثُ:

وراثت سے مراد یہاں مال کا ورثہ نہیں ہے بلکہ علم و فضل اور نبوت کا ورثہ مراد ہے کیونکہ دنیا کے مال کی تو انبیاء کرام کی نظر میں کچھ قدر و قیمت ہی نہیں ہوتی کہ وہ اس کی فکر کریں بلکہ وہ نہ مال کو جمع کرتے ہیں اور نہ ہی اس کے مالک بنتے ہیں۔

قرآن میں اللہ کے وارث ہونے کا ذکر ہے کہ:

وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ (3:180)

مفہوم: ''اور آسمانوں اور زمین کا وارث خدا ہی ہے''۔

مزید وضاحت کی کہ:

وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۲۳﴾ (15:23)

مفہوم: ''اور ہم ہی (سب کے) وارث (مالک) ہیں''۔

قرآن پاک میں ہے کہ پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کا وارث ٹھہرایا۔

يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ (21:105)

مفہوم: ''میرے نیکوکار بندے ملک کے وارث ہوں گے''۔

وراثت حقیقی تو یہ ہوتی ہے کہ انسان کو ایسی چیز حاصل ہو جائے جس کے متعلق اس پر نہ کوئی محاسبہ ہو اور نہ کسی قسم کی ذمہ داری عائد ہو اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندے چونکہ دنیا سے بوقت ضرورت قدر کفایت سے زیادہ نہیں لیتے اور پھر اسے جائز طریقہ سے حاصل کرتے ہیں تو جو شخص دنیا کو ان شرائط کے ماتحت حاصل کرے گا اس پر کسی قسم کا محاسبہ یا عقاب نہیں ہوگا۔

78۔ النافعُ:

اَلنَّفْعُ: ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے استعانت حاصل کی جائے یا وسیلہ بنایا جائے۔ یہ استعانت اللہ کی ذات پہنچاتی ہے۔

وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا (25:3)

مفہوم: ''اور کوئی بھی نہ اپنے نقصان اور نفع پہنچانے کا کچھ اختیار رکھتے ہیں''۔

خود رسول کی زبان سے بھی کہلوایا کہ:

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا (7:188)

مفہوم: ''کہہ دو کہ میں اپنے فائدے اور نقصان کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا''۔

اِس لئے مومنین یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے نفع ونقصان قوانینِ خداوندی کی پیروی کے باہر نہ دیکھیں اور اُنہی کی پابندی میں ضرر سے بچاؤ اور نفع سے مستفید ہوں۔

79۔ الجامعُ:

اَلْجَمْعُ: کے معنی ہیں متفرق چیزوں کو ایک دوسرے کے قریب لا کر ملا دینا۔

قُلْ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ط (34:26)

مفہوم: ''ہمارا پروردگار ہم کو جمع کرے گا، پھر ہمارے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے گا''۔

قرآن نے یہ بھی تصریح کر دی کہ:

لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (3:157)

مفہوم: ''تو جو (مال ومتاع) لوگ جمع کرتے ہیں اس سے خدا کی بخشش اور رحمت کہیں بہتر ہے''۔

جمعہ کے دن کو يَوْمُ الْجُمُعَةِ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں لوگ صلٰوۃ کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (62:9)

مفہوم: ''جب جمعہ کے دن صلٰوۃ کے لیے پکارا جائے تو خدا کی یاد کے لیے جلدی کرو''۔

مسجد الجامع کی اصل مَسْجِدُ الْاَمْرِ الْجَامِعِ او الوقت الجامع (ایسی مسجد جسمیں کسی معاملہ میں جمع ہوا جائے یا کسی وقت میں) لہٰذا یہاں جامع مسجد کی صفت نہیں ہے۔ جَمَّعُوْا کے معنی جامع یا جماعت میں حاضر ہونے کے ہیں۔

80۔ النورُ:

نور کے معنی ہیں روشنی، وہ پھیلنے والی روشنی جو اشیاء کے دیکھنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ دو قسم پر ہے۔ دنیوی اور اخروی۔ نور دنیوی پھر دو قسم پر ہے۔

1۔ معقول جس کا ادراک بصیرت سے ہوتا ہے یعنی امور الٰھیہ کی روشنی جیسے عقل یا قرآن پاک کی روشنی۔

2۔ محسوس جس کا تعلق بصر سے ہے جیسے چاند، سورج، ستارے اور دیگر اجسام روشنی کا خاصہ ہے کہ وہ اپنی دلیل آپ ہوتی ہے، یعنی وہ اپنے آپ کو دکھانے کے لئے کسی اور دلیل کی محتاج نہیں ہوتی۔ اس کا دوسرا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر شے کے اصلی

مقام کو متعین کر دیتی ہے اور اس کی کیفیت کو ٹھیک ٹھیک واضح کر دیتی ہے۔ خود اپنے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ:

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (5:15)

مفہوم: ''تمہارے پاس اللہ کی صِفت النور آ گئی یعنی ایک کھلا ہوا، واضح ضابطہء قوانین جس کے ذریعے اللہ ہر اس قوم کو، جو اپنی زندگی کو قوانین خداوندی سے ہم آہنگ رکھے، سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے اور انہیں ہر قسم کی تاریکیوں سے نکال کر، نور کی طرف لے آتا ہے''۔

دوسرے مقام پہ ہے کہ:

يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (5:16)

مفہوم: ''اللہ اس روشنی کے ذریعے ہر اس شخص کو جو اس کے رضوان سے ہم آہنگ ہوتا ہے، سلامتی کے راستوں کی طرف راہ نمائی کر دیتا ہے اور اس طرح انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آتا ہے''۔

یہی جماعتِ مومنین کا فریضہ ہے کہ وہ اسی روشنی سے قرآن میں دئے گئے پیغام کی بلاغت میں پورا پورا حصہ ڈالے۔

81۔ اللطیف:

لطیف کے معنی نرمی کا برتاؤ کرنے والا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ (42:19)

مفہوم: ''اللہ اپنے بندوں سے نرمی کا برتاؤ کرتا ہے''۔

لہٰذا اِسی صِفت کی پیروی میں مومنین کی بھی یہی روش ہوتی ہے۔

ان کے علاوہ کچھ صفات ایسی ہیں جو ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مختص ہیں۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں ہوسکتا۔ ان میں درج ذیل اہمیت کی حامل ہیں۔

82۔85۔ الاوّل، الآخر، الظاہر، الباطن:

اللہ تعالیٰ جہت زمان ومکان سے بلند وبالا ہے۔ جب کچھ نہ تھا تو وہ موجود تھا (الاوّل)۔

جب کچھ نہ ہوگا تو وہ موجود رہے گا (الاخر) ظاہر و باطن ہر جگہ موجود ہے۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ (57:3)

مفہوم: ''وہی ہے سب سے پہلا، اور سب سے پچھلا، اور باہر اور اندر''

86۔87۔ احیاء (زندگی)، اماتت (موت):

موت اور حیات بھی اس کے ہاتھ میں ہے۔ قرآن نے ان دونوں صفات کا ذکر ایجابی اور سلبی پہلو سے بیان کیا ہے۔ ایجابی پہلو میں۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ۣ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ (22:66)

مفہوم: ''اللہ وہ ہے جس نے تمہیں زندگی عطا فرمائی۔ پھر وہ تمہیں مارے گا اس کے بعد پھر زندہ کرے گا''۔

سلبی پہلو سے اس طرح کہ:

وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا (25:3)

مفہوم: ''اور (اللہ کے علاوہ) موت وحیات اور دوبارہ اُٹھانے کی قوت کسی اور کے پاس نہیں ہے۔''

آخر میں وضاحت کرنا ضروری ہے کہ درجِ بالا تمام بیان کردہ صِفاتِ خداوندی کو قرآن نے صِبغَۃ اللہ کی اصطلاح سے یوں متعارف کرایا ہے۔

صِبغَۃ اللہ اور اِس کی احسن ہونے کی قرآن سے وضاحت قرآن کریم میں ہے کہ:

وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۣ (2:138)

مفہوم: ''اللہ کا رنگ، اس رنگ سے زیادہ حسن وزیبائی پیدا کرنے والا رنگ اور کون سا ہوسکتا ہے؟''

راغب نے لکھا ہے کہ یہاں صِبغَۃَ اللہِ میں اس عقل کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر پیدا کی ہے اور وہ اس کے ذریعہ بہائم سے ممتاز ہوتا ہے جیسا کہ فطرت انسانیہ۔ نصاریٰ کے ہاں دستور یہ تھا کہ جب بچہ پیدا ہوتا تو وہ ساتویں روز سے ''عمودیۃ'' (زرد رنگ کے پانی) میں غوطہ دیتے اور اس کو صِبغَۃَ اللہِ، اللہ کا رنگ کا نام دیتے تھے۔

یہاں البتہ اتنی وضاحت کرنا ضروری ہے۔ کہ صِبغَۃَ اللہِ میں اس نکتہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے کہ یہ صفات اس پیمانے یا معیار کی نہیں جس پیمانے کی صفات بطور معیار خیر انسانوں میں ہونی چاہیے۔ انسانی صفات میں جیسا کہ بتایا گیا ہے جذبات کا دخل ہوتا ہے اور خدا جذبات سے بلند، منزّا اور مبرّا ہے۔ نیز انسانی صفات محدود پیمانے پر ہوتی ہیں اور خدا کی صفات لا محدود پیمانے پر۔ اس لیے خدا نے کہا ہے کہ ان صفات کی رو سے ذہن انسانی خدا کے متعلق جو تصور قائم کرتا ہے، اس کی ذات اس سے بلند وبالا ہے۔ محدود ذہن، لامحدود کا تصور کر ہی نہیں سکتا۔

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ (23:91)

مفہوم: ''اللہ نرالہ ہے ان (انسانوں) کی بتلائی باتوں سے''۔

صبغۃ اللہ سے مراد کوئی ایسی ''روحانیت'' نہیں ہے، جسے خانقاہوں میں چلہ کشی سے حاصل کیا جائے۔ یہ نام ہے، صِفات وقوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا جو، قرآنی معاشرہ کے اندر ممکن ہے۔ لہٰذا، قوانین خداوندی کی ہم آہنگی سے انسان کے اندر ایک بنیادی تبدیل پیدا ہو جاتی ہے، جس سے وہ ایک بالکل دوسرا انسان بن جاتا ہے یعنی اس کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پالیتی ہیں، اور اس میں صفات خداوندی کا رنگ منعکس ہوتا چلا جاتا ہے۔

اِس آیت میں کہا گیا ہے کہ اللہ کا رنگ سے زیادہ حسن وزیبائی پیدا کرنے والا رنگ اور کون سا ہوسکتا ہے؟ امام راغب نے لکھا ہے کہ اَلْحَسَنُ کا لفظ عرف عام میں اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو بظاہر دیکھنے میں بھلی معلوم ہو لیکن قرآن پاک

میں حَسَنٌ کا لفظ زیادہ تر اس چیز کے متعلق استعمال ہوا ہے جو عقل و بصیرت کے رو سے اچھی ہو۔ خدا نے، قرآن کے اندر اپنی صفات کا ذکر اسی لیے کیا ہے تا کہ خدا کا صحیح تصور ذہنوں کے اندر قائم ہو جائے۔ خدا کے تصور کی بات محض نظری، تصوّری یا اعتقادی نہیں ہے بلکہ اس لئے ہے کہ قوموں کی زندگی کا سارا دارومدار اس پر ہے کہ خدا کا تصور کس قسم کا ہے۔ اللہ کی صفات کو اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ط (59:24) کہا گیا ہے، کیونکہ اللہ کی ذات وہ ہے، جس میں مختلف صفات اپنے پورے پورے تناسب و توازن لئے جمع ہیں۔

حسن سے عام طور پر توازن کے معانی میں مقتصد کا مفہوم مراد لیا جاتا ہے کہ کسی معاملہ میں میانہ روی اور اعتدال اختیار کرنا۔ قرآن کریم سے مقتصد کے معانی میانہ روی کی وضاحت ملتی ہے، جہاں کہا ہے کہ ہم نے وراثت کتاب کے لئے اپنے بندوں میں سے ایک قوم کو چن لیا ہے۔ فرمایا:

فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ (35:32)

مفہوم: ''سو ان میں سے کوئی وہ ہیں جو اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے، کوئی میانہ رو ہے، اور کوئی نیکیوں میں سبقت کرنا والا ہے''۔

ظاہر ہے کہ ان تین گروہوں میں سے قابل ستائش قرآنی معیار کے مطابق سبقت والا گروہ ہے، اور ظلم کرنے والے بدتر ہیں۔ لیکن ان کے درمیان بین بین ایک طبقہ ہے جو نہ بھلائی کے کاموں میں صبغۃ اللہ کے منعکس کرنے میں آگے بڑھتا ہے اور نہ ہی اس کا شمار ظالموں کے طبقہ میں ہوتا۔ یہ طبقہ ظالموں کے گروہ سے ذرا اونچا ہوگا اور سابق الخیرات کے گروہ سے بہرحال نیچے۔ لیکن اس روش کو قرآن کریم کی رو سے قابل ستائش نہیں کہا جائے گا۔ قرآنی معیار پر وہی پورا اتریں گے، جو سابق الخیرات ہو کر قُربِ صبغۃ اللہ منعکس کرنے میں بالا از بالاتر ے یعنی سب سے آگے ہوں گے۔ اس وضاحت سے ظاہر ہے کہ یہ جو عام طور پر اسلام کے متعلق مطلقاً کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اعتدال کا راستہ ہے، اور امت وسط وہ قوم ہے، جو درمیان کی راہ پر چلتی ہے، تو یہ صحیح نہیں ہے۔ اسلام حق کا راستہ ہے، نہ کہ حق و باطل کی درمیانی راہ۔ اور امت وسط، حق پر سب سے آگے چلنے والی جماعت ہے، نہ کہ حق و باطل اور عدل و ظلم کے بین بین چلنے والی جماعت۔ البتہ جہاں دونوں سمتیں مذموم ہوں مثلاً اسراف و بخل تو وہاں اسلام احتیاط کی درمیانی راہ کی تعلیم دیتا ہے، کیونکہ وہی راہ محمود ہوتی ہے۔

اَلْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی کے بارے میں ہمیں ہمیشہ نگاہ میں رکھنا ہوگا کہ قرآن میں دی گئی خداوندی متعدد اور متنوع ہونے کے علاوہ بعض مقامات پر باہم دگر متضاد بھی ہیں۔ مثلاً وہ رحیم و کریم بھی ہے اور جبار و قہار بھی۔ ذات خواہ خدا کی ہو یا انسان کی، اس کے معنی یہی لئے جاتے ہیں کہ جس جگہ جس قسم کی صفت کی نمود ضروری ہو، وہاں اس صفت کا ظہور ہو۔ اگر عدل کے مقام پر غفور، اور رحیم کی جگہ جباریت اور قہاریت کی صفات کا ظہور ہو جائے تو اس سے نظامِ عالم میں فساد برپا ہو جائے گا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے متعین کیا جائے کہ کس مقام پر کس صفت کا ظہور ہونا چاہئے؟ آپ قرآن کریم میں دیکھیں گے تو عام طور پر اس کی آیات کے آخر میں کسی نہ کسی صفتِ خداوندی کا ذکر ہوگا۔ اگر آپ ان آیات کی گہرائی میں جائیں گے، تو اس سے حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ جس قسم کے احوال و کوائف کا ذکر ان آیات میں آیا ہے، ایسے مقام پر اس صفت کا ظہور ہونا چاہیے، جو ان آیات کے آخر میں آئی ہے۔ عفو کے مقام پر عفو، عدل کے مقام پر عدل۔ یہی سُنت اللہ ہے۔ (جاری ہے)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لغات القرآن

ج ھ ل جَھَنَّمُ اور ج و ب

اَلْجَھْلُ کے معنے ہوتے ہیں جو امور واضح نہ ہوں ان کی واقفیت حاصل کئے بغیر ان میں پیش قدمی کرنا۔ راغب نے کہا ہے کہ جَھْلٌ کی تین قسمیں ہوتی ہیں (1) انسان کے ذہن کا علم سے خالی ہونا (یہ بنیادی معنے ہیں)۔ (2) کسی بات کے متعلق اس کی صحیح کیفیت کے خلاف اعتقاد رکھنا اور (3) کسی بات کو جس طرح کرنا چاہئے اس کے خلاف کرنا۔ خواہ اس کی بابت اعتقاد صحیح ہو یا غلط (تاج)۔ ابن فارس نے کہا ہے کہ اس کے بنیادی معنے (1) علم کی ضد اور (2) ہلکا پن اور بے اطمینانی کے ہیں۔

مَجْھَلٌ، اس زمین کو کہتے ہیں جس میں نشانات راہ نہ ہونے کی وجہ سے صحیح راستہ نہ مل سکے (تاج)۔ صاحب محیط نے کہا ہے کہ اَلْجَھُوْلُ اس سادہ لوح اور ناتجربہ کار آدمی کو کہتے ہیں جو جلد دھوکے میں آ جائے (محیط)۔ صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ جَاھِلٌ کا لفظ مذمت کے لئے آتا ہے لیکن کبھی اس کے معنے ناواقف کے بھی ہوتے ہیں۔ اس صورت میں یہ لفظ مذمت کے لئے نہیں آتا۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے یَحْسَبُھُمُ الْجَاھِلُ اَغْنِیَآءَ (2:273) ''ناواقف انہیں دولتمند سمجھتا ہے''۔

عربوں کے زمانۂ قبل از اسلام کے لئے جَاھِلِیَّۃٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں بھی اس لفظ کا استعمال آیا ہے (مثلاً 33:33)۔ اس کے معنے یہ نہیں کہ وہ لوگ جاہل مطلق تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دین سے ناواقف تھے۔ جاہلیت سے مراد ان کی جہالت نہیں بلکہ اس دین سے ناواقفیت ہے جو نبی اکرم ﷺ کے ذریعہ ان تک پہنچا۔ لہٰذا رسوم جاہلیت سے مراد وہ رسوم ہی نہیں جو زمانۂ قبل از اسلام میں عربوں کے ہاں رائج تھیں۔ اس سے مراد وہ تمام غلط اعتقادات اور غیر قرآنی اعمال حیات ہیں جو دین سے ناواقفیت کی بنا پر مسلمانوں میں پھیل رہے ہیں۔ نیز علم ہو جانے کے بعد بھی اسی روش پر جمے رہنا (محض اس لئے کہ وہ روش اسی طرح چلی آ رہی ہے) جاہلیت ہے۔ یہ مسلک پتھروں کا ہے جو کسی حالت میں بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلتے۔ اسی لئے بڑی چٹان کو صَفَاۃٌ جَیْھَلٌ کہتے ہیں (محیط)۔ یہ جہالت و جاہلیت کی بدترین قسم ہے۔ اسی لئے صاحب تاج العروس نے اسے جَھْلٌ مُرَکَّبٌ سے تعبیر کیا ہے (تاج)۔

احمد امین مصری (مرحوم) نے کہا ہے کہ ''سَلَامٌ کے معنے مسالمت کے ہیں جو جنگ اور مخاصمت کی ضد ہے۔ قرآن کریم کی اس آیت وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَھُمُ الْجٰھِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾

(25:63) میں جَھَالَت کے مقابلہ میں سَلَام کا لفظ لایا گیا ہے۔ غالباً اس آیت کے ذریعہ ہم وہ وجہ معلوم کر سکتے ہیں جس کی بنا پر نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے زمانہ کو جاہلیت کا اور بعثت کے بعد کے زمانہ کو اسلام کا لقب دیا گیا۔ یہ لفظ ''جاہلیت'' اس جَھْلٌ سے ماخوذ نہیں جس کے معنے نہ جاننے (عِلْمٌ کی ضد) کے ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ اس ''جَھْلٌ'' سے ماخوذ ہے جس کے معنے سفاہت، غضب اور حمیت کے ہوتے ہیں۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ انہوں نے کسی کو اس کی ماں کے نام سے عار دلائی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اِنَّكَ اَمرُؤٌ فِيكَ جَاهِلِيَّةٌ۔ ''تمہارے اندر جاہلیت کی روح اب تک موجود ہے''۔ اسی جہت سے عربوں کا محاورہ ہے ''اِسْتَجْهَلَه الشيبُ''۔ یعنی اس چیز نے اسے عقل و خرد سے بیگانہ بنا دیا۔ کسی شاعر کا مصرع ہے۔ دَعَاكِ اَلْهَوَى وَاستَجْهَلَتْكَ الْمَنَازِلُ۔ محبت نے تجھے پکارا اور محبوب کے مکانوں نے تیرے حواس گم کر دیئے۔ عمرو بن کلثوم کے معلقہ میں ہے۔

اَلَا لَا يَجْهَلَنْ اَحَدٌ عَلَيْنَا
فَنَجْهَلُ فَوْقَ جَهْلِ الْجَاهِلِيْنَا

خبردار کوئی ہمارے خلاف زیادتی نہ کرے ورنہ ہم زیادتی کرنے والوں سے بڑھ کر زیادتی کرینگے۔ ان استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ جَاهِلِيَّةٌ کا لفظ ہلکے پن، عقل و ہوش سے بیگانگی، عصبیت، حمیت اور مفاخرت وغیرہ کے لئے استعمال ہوتا تھا جو اسلام سے پہلے عربوں کی زندگی کا اہم ترین عنصر تھا۔ اسی لئے اس زمانہ کو جاہلیت کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ ان معانی کے بالمقابل سکون نفس، تواضع، اعمال صالحہ کی اہمیت کا احساس اور نسلی فخر و غرور کی بے اعتباری وغیرہ کے رجحانات، سلامتی اور مصالحت کے ہوتے ہیں۔'' (فجر الاسلام، ص 70-69)۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی نہجِ زندگی کیا ہے اور جاہلیت کی روش کیا؟

قرآن کریم کی رو سے علم حاصل نہ کرنا جرم ہے اور علم حاصل ہو جانے کے بعد اپنی غلط روش میں تبدیلی نہ کرنا اس سے زیادہ سنگین جرم (مزید تفصیل ع۔ل۔م اور ع۔ق۔ل کے عنوانات میں ملے گی)۔ سورۃ بقرہ میں یہ لفظ هَزْوٌ کے ساتھ آیا ہے (2:67) لہٰذا اس کے معنے ہیں وہ لوگ جو زندگی کے مسائل اور احکام و قوانین کو سنجیدگی سے (Seriously) نہ لیں۔ انہیں مذاق ہی سمجھیں۔

❁❁❁

جَهَنَّمُ

جَهَنَّمُ۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ عربی لفظ ہے جس کے معنے ہیں گہرا۔ کہتے ہیں رَكِيَّةٌ جَهَنَّمٌ۔ ''گہری تہ والا کنواں''۔ بعض نے اسے عبرانی لفظ گِھنَّامْ سے معرب مانا ہے (تاج)۔

صاحب محیط نے لکھا ہے کہ یہ عبرانی الاصل ہے اور دو لفظوں سے مرکب۔ جِیْ هِنُّوْمْ یروشلم کے جنوب میں ایک

مشہور وادی تھی جس میں زمانہ قدیم میں مولوک (عَمُّوْنِیِّیْن کے دیوتا) کے حضور آدمیوں کو جلا کر قربانی پیش کی جاتی تھی۔ لہٰذا جِیْ هَنُّوْمْ سے مراد تھی وہ وادی جہاں انسان ذبح کئے جاتے تھے اور انہیں جلایا جاتا تھا (محیط' نیز غریب القرآن میرزا ابوالفضل)۔ اس اعتبار سے جَهَنَّم کا ترجمہ انسانیت کی قربانگاہ ہوگا۔ خدا کے قانون ربوبیت کا منشا یہ ہے کہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو۔ انسانیت برومند اور ثمر بار ہو۔ ایسا معاشرہ جس میں انسانیت نشوونما پائے جنتی معاشرہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں وہ معاشرہ جس میں انسانیت ذبح ہو جائے اور جل کر راکھ کا ڈھیر بن جائے جَهَنَّمی معاشرہ ہے۔ اس کے لئے عربی لفظ جَحِیْمٌ ہے جس کے معنے روک دینا ہیں (دیکھئے عنوان ج ح م)۔ یعنے جس مقام پر انسانیت کی نشوونما رک جائے۔ سورۃ بنی اسرائیل میں جَهَنَّم کے متعلق کہا ہے: وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ حَصِيْرًا ۝ (17:8) جہنم ان لوگوں کے لئے روک کا مقام ہے جو قانون خداوندی کے خلاف زندگی بسر کرتے ہیں۔

چونکہ زندگی مسلسل آگے بڑھتی ہے اس لئے جس کی نشوونما یہاں رک جاتی ہے وہ زندگی کی اگلی منزلیں طے کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اس لئے اس زندگی میں بھی وہ جَهَنَّم میں رہتا ہے اور مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی۔ اس زندگی میں جَهَنَّم کی کیفیات کیسی ہوں گی' اس کے متعلق ہم آج کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ البتہ موجودہ زندگی میں جَهَنَّم کا عذاب ہم ہر وقت محسوس کر سکتے ہیں۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔ اجتماعی طور پر جو قوم غلط راستے پر چلتی ہے اس کی سعی وعمل ثمر بار ہونے کی بجائے جل کر خاکستر ہو جاتی ہے۔ یہ جَهَنَّم ہے۔ اور اس کا نتیجہ ذلت ورسوائی۔ اس کی تفاصیل قرآن کے مختلف مقامات میں ملیں گی۔ اسی طرح اس معاشرہ میں رہنے والے افراد کے جوہر انسانیت جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جہنم' انسان کے اپنے اعمال ہی سے بنتی ہے۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ: وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ (29:54) ''یقیناً جہنم کفار کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے''۔ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ۝ (82:16) یہ اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں۔ وہ انہیں اب بھی دیکھ رہی ہے۔ ان کے سامنے ہی ہے' لیکن ان کا عدم احساس اسے ان کی نظروں سے اوجھل کئے ہوئے ہے۔ جب ان کی آنکھیں کھل جائیں گی تو وہ ابھر کر سامنے آ جائے گی۔ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ۝ (79:36) وہ دیکھنے والے کے لئے ابھر کر سامنے آ جائے گی۔ یہ وہ کیفیت ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ لوگ اس میں ''يَوْمَ الدِّيْنِ'' میں داخل ہوں گے يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ۝ (82:15) يَوْمَ الدِّيْنِ ظہورِ نتائج کا زمانہ ہے' اس دنیا میں یا مرنے کے بعد۔

ج و ب

اَلْجَوْبُ۔ قطع کرنا۔ پھاڑنا۔ سوراخ کرنا۔ یہ اس مادہ کے اصلی معنے ہیں (تاج)۔ قرآن کریم میں ہے وَثَمُوْدَ الَّذِيْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ ۝ (89:9) اور ثمود جو وادی میں پہاڑوں کی چٹانوں کو تراش کر (اپنے مکان بناتے تھے)۔ اَلْجَوْبَةُ۔ مکانات کے پچھواڑے جو گڑھا سا بن جائے جس میں بارش کا پانی جمع ہو جائے (تاج)۔ اَلْجَوْبُ ڈھال کو بھی کہتے ہیں (تاج)۔

اَجَابَ۔ یُجِیْبُ۔ اِجَاباً و اَجَابَۃً۔ جواب دینا۔ (اس لئے کہ جواب دینے والا جب کسی کی بات کا جواب دیتا ہے تو وہ اس کے منہ سے نکل کر سائل کے کانوں تک کا فاصلہ قطع کرتی ہے۔ ویسے سوال بھی یہ فاصلہ طے کرتا ہے لیکن یہ لفظ جواب کے لئے خاص ہو گیا ہے۔ راغب)۔ اس سے اسمِ فاعل مُجِیْبٌ ہے۔ جواب دینے والا۔ قرآن میں ہے اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ﴿۶۱﴾ (11:61) ''یقیناً میرا رب قریب ہی ہے اور بات کا جواب بھی دیتا ہے۔'' سورۃ بقرہ میں ہے اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (2:186) ''میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے۔'' دعا اور خدا کی طرف سے اس کے جواب کے صحیح مفہوم کے لئے (د۔ع۔و) کا عنوان دیکھئے۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ دُعَا سے مفہوم ہے خدا کے قوانین کا اتباع کرنا اور اس کی طرف سے جواب کے معنی ہیں ان قوانین کا نتیجہ خیز ہونا۔ چنانچہ سورۃ المومن میں ہے: وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (40:60) ''تمہارا نشوونما دینے والا کہتا ہے کہ تم مجھے پکارو میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔'' اس کے بعد ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَھَنَّمَ دٰخِرِیْنَ ﴿۶۰﴾ (40:60) جو لوگ میری اطاعت گزاری سے سرکشی برتتے ہیں وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔'' اسی پوری آیت سے واضح ہے کہ دعا درحقیقت ''یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ'' کی ضد ہے۔ لہٰذا دعا سے مقصود خدا کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔ اسی لئے اس سے ذرا پہلے ہے وَمَا دُعٰٓؤُا الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ ﴿۵۰﴾ (40:50) ''جو لوگ قوانین خداوندی سے انکار کرتے ہیں ان کی دعا کبھی نتیجہ خیز نہیں ہوتی۔'' یہی وجہ ہے کہ سورۃ بقرہ میں جہاں یہ کہا ہے کہ: اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (2:186) ''میں پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں'' تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ: فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ (2:186) ''لہٰذا انہیں چاہئے کہ میرے قوانین پر ایمان رکھیں اور میری اطاعت کریں'' یہ لوگ یہ کچھ کریں اور میں ان کی سعی و عمل کو نتیجہ خیز کروں گا۔ یہ ہے دعا اور اجابتِ دعا کا قرآنی مفہوم۔ یعنی جو کچھ خدا کے تقاضے ہیں انہیں تم پورا کرو۔ جو کچھ تمہارے تقاضے ہوں گے خدا انہیں پورا کر دے گا۔ یہی خدا کا قانون ہے۔ جو شخص حسن کارانہ انداز سے اس کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے وہ اس کی محنت کو رائیگاں نہیں جانے دیتا۔ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۱۵﴾ (11:115) ''اور استقامت سے جمارہ۔ بے شک اللہ محسنین کا اجر ضائع نہیں کرتا۔'' اور کوشش کے بغیر کچھ ملتا نہیں۔ وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴿۳۹﴾ (53:39) ''انسان کے لئے کچھ نہیں بجز اس کے جس کے لئے وہ کوشش اور محنت کرے۔''

سوال دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تو کسی بات یا مسئلہ کا دریافت کرنا اور دوسرے امداد و اعانت طلب کرنا۔ لہٰذا اس اعتبار سے جواب کی بھی دو قسمیں ہوں گی اور اجابت و استجابت' ان دونوں قسموں کے جواب کے لئے بولا جائے گا۔ یعنی کسی سوال کا جواب دینا' یا کسی مانگ اور مطالبہ کو پورا کر دینا۔

❁❁❁

محمد علی صابر صدیقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نشست نمبر 2

نوجوانوں کا صفحہ

نخلِ سینا

آج چھٹی کا دن ہے۔ گھر میں سارے افراد آرام سے سو رہے ہیں۔ لیکن کلیم الزمان شب خوابی کے لباس ہی میں ڈرائنگ روم میں بیٹھے سامنے دیوار پر لگے ہوئے کتبے کو بار بار دیکھتے ہیں۔ کبھی ان کے چہرے پر مایوسی کے اثرات پیدا ہوتے ہیں اور کبھی بشاشت سے انکا چہرہ چمک اٹھتا ہے۔ کتبہ کیا ہے قرآن مجید کی ایک آیت "ان الحسنات یذہبن السیآت" اسی قسم کا کتبہ ان کے بیڈروم میں بھی ہے اور ڈرائنگ روم میں بھی۔ ان کے چہرے پر مایوسی اس لئے چھا جاتی ہے کہ انہیں گذشتہ زندگی کی غلط کاریوں کی یاد سانپ کی طرح ڈستی رہتی ہے اور خوشی کی لہر اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انہیں اللہ کا وعدہ یاد آتا ہے کہ "ان الحسنات یذہبن السیآت" اور انہیں یہ بھی یاد آجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ (39:53) اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہونا۔

کلیم الزمان (سربراہ) صاحب کا گھرانہ تین پشتوں سے وکالت اور عدالت کے پیشے سے منسلک تھا۔ ان کے دادا مولوی فخر الزمان نے اس وقت وکالت شروع کی تھی جب ہندوستان میں باقاعدہ انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی اور مولوی نذیر احمد نے انڈین پینل کوڈ کا ترجمہ کر کے تعزیرات ہند کی صورت میں ہندوستان کے باشندوں کو ایک نئی طرز حکومت سے آگاہ کیا اور اس نئی طرز حکومت نے ہندوستان کے لوگوں کا طرز زندگی بدلنا شروع کر دیا۔ اسلامی تہذیب کے وسطی دور میں رشوت قصیدہ کی صورت میں پیش کی جاتی تھی۔ اس کے بعد اس نے نذرانے کی صورت اختیار کر لی اور انگریزی دور میں اس کا نام ڈالی ہو گیا۔ ڈالی کیا تھی ایک ٹوکری ہوتی تھی جس میں بظاہر کچھ پھل وغیرہ ہوتے لیکن ان کے نیچے رشوت کی رقم ہوتی تھی۔ دوسرے محکموں کے ساتھ ساتھ رشوت کا یہ طریق تشکیل پاکستان سے پہلے اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ بڑے بڑے سیٹھ سونے کی رکابی میں تھوڑا سا ڈرائی فروٹ صاحب بہادر کے گھر بھیج دیا کرتے تھے۔ رشوت کے ان طریقوں سے بار اینڈ بینچ دونوں مستثنیٰ نہیں رہے۔

میں علامہ اقبالؒ یا قائداعظم اور سر تیج بہادر سپرو قسم بزرگوں کی بات نہیں کر رہا۔ میں ان وکیلوں کی بات کر رہا ہوں جن کے ریوڑ کے ریوڑ عدالتوں کے باہر بیٹھے اپنے شکار کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں اور کلیم الزمان صاحب بھی انہیں میں سے ایک

تھے۔ میں صیغہ ماضی استعمال کر رہا ہوں جس کی وضاحت آئندہ صفحات میں ہوگی۔ پشاور میں ہمارے ایک کرم فرما وکیل نے اپنے چیمبر میں ایک چارٹ لکھ کر لٹکایا ہوا تھا جس کا سرنامہ یہ شعر تھا۔

پیدا ہوئے وکیل تو شیطان نے کہا لو آج ہم بھی صاحب اولاد ہو گئے

چارٹ کے مشمولات کچھ اس طرح ہیں۔

''میں چند ٹکے لے کر جھوٹ بولتا ہوں۔ میں قاتل کو بری کراتا ہوں۔ میں عدالت کو بیچتا ہوں۔ میں زانی کو سزا ملنے سے بچاتا ہوں۔ میں ڈاکوؤں کا بالفاظ دیگر ساتھی ہوں۔ میں اکثر بددیانتی کرتا ہوں۔ میں چور کو چھڑاتا ہوں۔ میں انصاف کو فروخت کرتا ہوں۔ میں شراب پینے والوں کی خلاصی کروا کر ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں۔ میں موکلہ کو بُری نیت سے تاڑتا ہوں۔ میں مجرم کو چھوٹ جانے پر اسے مبارک باد دیتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ فیس ملنے والی جب کوئی بغل کھجاتا ہے میں کام نکلوانے سے پہلے افسر جلیس کی خوشامد کرتا ہوں۔ ان اوصاف کے ہوتے ہوئے معاشرے سے معزز کہلوانے کا آرزو مند ہوں کیوں کہ اس قلندر صفت راست گو وکیل یا ایڈووکیٹ نے اپنی آخری صفت میں مصلحتاً جلیس کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ورنہ برصغیر میں یہ روایت رہی ہے کہ وکیل صاحبان ججوں کو رشوت دے کر اپنے مؤکل کے حق میں فیصلہ کروالیتے ہیں اور اس طرح جب وہ مقدمات پر مقدمات جیتتے چلے جاتے ہیں تو اپنی شہرت کی بناء پر ایک نہ ایک دن خود عدالت کی کرسی ان کا استقبال کرتی ہے، اور ایک ہی جست میں چور سے قطب ہو جاتے ہیں۔

کلیم الزمان (سربراہ) کی زندگی بھی دوسرے وکلاء سے مختلف نہ تھی۔ تقسیم ملک کے بعد ان کا گھرانہ دلی سے لاہور منتقل ہو گیا۔ کچھ مدت تک وکالت کی گرم بازاری رہی اور جلدی ہی انہیں کرسی عدالت بھی مل گئی۔ پیٹ بھر کر نذرانے اور ڈالیاں وصول کیں۔ کبھی رشوت لینے سے انکار کے سبب اور کبھی لے لینے کی وجہ سے ضمیر کے کچوکے پریشان کرتے تو وہ یہ سوچ کر دل کو مطمئن کر لیتے کہ فرانسس بیکن جیسا فلسفی جج رشوت لیتے ہوئے نہیں شرماتا تو میں تو ایک معمولی جج ہوں اور اگر ضمیر زیادہ ہی جھنجھوڑتا تو دل سے کہتے کہ۔

تمہارے وعظ میں تاثیر تو ہے حضرت واعظ اثر لیکن نگاہ ناز کا بھی کم نہیں ہوتا

جب ایوب نہرو پیکٹ کے نتیجہ میں ری ہیبلیٹیشن اور کسٹوڈین کے محکمے قائم ہوئے تو کلیم الزمان کے وارے نیارے ہو گئے۔ کوٹھیاں الاٹ ہو گئیں اور کئی فیکٹریوں کے مالک ہو گئے اور خدا نے چھپڑ پھاڑ کر دینا چاہا تو کچھ ہی دنوں میں ارب پتی ہو گئے۔ تقسیم ہند سے پہلے بھی مسلمان قوم کرپشن کے معاملہ میں کریلے کی طرح کڑوی تھی۔ ایوب نہرو پیکٹ نے اس کریلے کو نیم پر چڑھا دیا۔ جس کی کڑواہٹ کا مزا پاکستان کے ہر محکمہ میں چکھا جا سکتا ہے۔ آخر کار جب ریٹائر ہوئے تو زندگی میں بیکاری کی وجہ سے یبوست سی محسوس ہونے لگی کرنے کو کچھ نہیں تھا، بس کچھ دیر کے لئے محلہ کی مسجد میں جا بیٹھتے۔ اب جو لاء (Law) پڑھا ہوا تھا وہ کسی کام نہیں آ رہا تھا۔ مسجد میں کسی نوجوان کے منہ سے ایک ایسی بات نکل گئی جو کلیم الزمان کے دل کو بھلی لگی۔ وہ

نوجوان اپنے کسی دوست کو کہہ رہا تھا کہ بی اے، ایل ایل بی کا مطلب ہے۔ بیچولر آف لا اینڈ لٹریچر ہونا چاہیے۔ کلیم الزمان صاحب نے کبھی لٹریچر کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ اسی لئے کردار سازی نہ ہوسکی۔ ہمارے ہاں جب کبھی لٹریچر کا خیال آتا ہے تو ذہن میں غالب، اقبال یا فیض کے نام ابھرتے ہیں۔ دلی اور لکھنؤ کے لوگوں کو غالب بہت پسند ہے۔ کلیم الزمان صاحب کی حرص وہوس برقرار تھی اور وہ قانون سے متعلق اپنی معلومات اور اپنے علم کی وجہ سے وکالت کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد دوسال تک وہ قانوناً ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ اسلئے انہوں نے ارادہ کیا کہ یہ دوسال وہ لٹیریچر پڑھنے میں صرف کریں گے۔ چنانچہ دیوان غالب جو اٹھایا تو کچھ شعر تو نہایت معمولی قسم کے تھے اور کچھ ایسے تھے جن کا سمجھنا ان کے لئے مشکل تھا۔ کوشش کرنے پر بھی حالت یہ تھی کہ ؎

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

فیض کو پڑھنے میں کلیم الزمان صاحب کو بڑا مزا آیا، اور جب اقبال کو سمجھنا چاہا تو بعض اشعار خاص کر غزلیات تو بہت اچھے تھے مگر زیادہ تر کلیم الزماں صاحب کی ذہنی رسائی سے باہر تھے۔ کسی دوست نے انہیں مشورہ دیا کہ اقبال کو اگر سمجھنا ہے تو اس کے شارح غلام احمد پرویز کو پڑھو۔ کلیم الزماں نے پرویز کا نام تو سن رکھا تھا اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ وہ منکر حدیث ہے اور اس پر کفر کا فتویٰ لگ چکا ہے۔ ان کے دوست نے انہیں کہا کہ کفر کا فتویٰ تو اقبال پر بھی لگا تھا اور اس سے پہلے سر سید احمد خان پر بھی لیکن تاریخ جانتی ہے کہ سرسید احمد خان کے تصورات نے علی گڑھ یونیورسٹی دے کر کہا تھا۔

نہ دارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم فلاطوں طفلکے باشد بہ یونانے کہ من دارم

اقبال کے فلسفہ نے ہمیں پاکستان دیا۔ اسلئے میں تو یہ کہونگا کہ آپ اقبال کا مطالعہ کریں۔ اقبال تو ان فتویٰ فروشوں کو دہریہ کہتا ہے اور اگر ان کے خیالات اور مذہبی تصورات کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اقبال درست کہتا ہے کہ ؎

حقیقت را بہ رندے فاش کردند کہ ملاکم شناسد رمز دیں را

اقبال کے دو تین معمولی شعروں کی تشریح کرنی پڑے تو اس پر پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے اور وہ شعر ہیں۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

فریب نظر ہے سکون و ثبات تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

کلیم الزمان کا دوست تو ان سے اجازت لے کر رخصت ہو گیا اور وعدہ کر گیا کہ وہ اپنی مصروفیات سے فارغ ہو کر ضرور خدمت اقدس میں حاضر ہوگا لیکن کلیم الزمان کو ذہنی مخمصے میں چھوڑ گیا۔ انہوں نے کلیات اقبال منگوائی اور اس کی ورق گردانی میں پورا دن لگا دیا۔ بہت سی باتیں سیاسی نوعیت کی تھیں جن سے کلیم الزماں صاحب پہلے ہی واقف تھے۔ کچھ ایسی بھی کہ جن کا تعلق مسلمانوں کی خستہ حالی کا مرثیہ کہنا چاہیے، لیکن بہت سی باتیں ایسی تھیں جو کلیم الزماں کی ذہنی رسائی سے دور تھیں اور

جنہیں سمجھنے کے لئے انہیں راہنمائی کی ضرورت تھی۔ اقبالیات کے موضوع پر کتاب فروشوں کی دکانیں بھری پڑی تھیں جن کے لکھنے والے معتبر قسم کے لوگ تھے لیکن علامہ اقبال کو قرآنی فلسفہ کے حوالے سے سمجھنے کے لئے انہیں بتایا گیا تھا کہ صرف ایک شخص ہے جس کا نام غلام احمد پرویز ہے لیکن یہاں ایک مشکل یہ درپیش ہے کہ "نشان راہ" کے مصنف نے کہا ہے علامہ پرویز کی نگارشات کم پڑھے لکھے اصحاب کے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔ انہیں سمجھنے کے لئے وسعت قلب اور دقت نظر کی ضرورت ہے۔ اسلئے ضروری ہے کہ عام فہم کا طالب علم جو علامہ موصوف کی نگارشات سے مستفیض ہونے کا ارادہ رکھتا ہو اسے سب سے پہلے ان کی کتاب **معراج انسانیت** کا مطالعہ کرنا چاہیے اور ذہنی ہاضمہ کے لئے ان کی تصنیف "**سلیم کے نام خطوط**" بھی مفید اضافہ ہوگا۔

کلیم الزمان صاحب کے ہاں پیسوں کی کمی نہیں تھی کہ سوچیں کہ کونسی کتاب خریدی جائے کونسی کا حصول مؤخر کر دیا جائے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اقبال اور پرویز کا بہت سا لٹریچر خرید کر اپنے مطالعہ کی الماریوں میں سجا دیا اور دن رات قرآن مجید، اقبال اور علامہ پرویز کے مطالعہ میں مصروف ہو گئے، لیکن دل میں ایک کانٹا تھا جو ہر وقت انہیں تنگ کر رہا تھا اور اسے نکالنے کے لئے کلیم الزمان کو ایک آیت قرآن ہاتھ لگ گئی اور وہ تھی ''اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ (11:114)''

کوئی دعویٰ نہیں

کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں۔ میں نے قرآنِ کریم کو اپنی بصیرت کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اسی فکر پر اس تحریک کی بنیاد رکھی ہے میری یہ فکر میری تحریروں میں محفوظ ہے اور انہی تحریروں کا میں ذمہ دار ہوں۔ اگر کوئی شخص کوئی ایسی بات میری طرف منسوب کرے جو میری تحریروں میں نہیں، تو اس بات کو نہ کوئی سند حاصل ہو سکتی ہے نہ میں اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہوں، خواہ وہ شخص مجھ سے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو۔ میں نے اس وارننگ کو اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ سلسلہ ابھی سے شروع ہو گیا ہے۔ اس زمرہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو باتیں تو اپنی طرف سے کرتے ہیں، اور منسوب کر دیتے ہیں۔ انہیں تحریک طلوعِ اسلام کی طرف، وہ دانستہ ایسا کرتے ہوں یا نادانستہ، دونوں صورتوں میں اس سے تحریک کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ تحریک کیلئے سند صرف وہ تحریریں ہیں جو اس کی طرف سے شائع ہوئی ہیں، نہ کہ زبانی روایات خواہ راوی کتنے ہی ثقہ کیوں نہ ہوں میری درخواست ہے کہ آپ احباب اس کا بھی خاص طور پر خیال رکھیں۔

(پرویزؔ، سالانہ کنونشن، 17 تا 20 مارچ 1966ء)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(گذشتہ سے پیوستہ)

پاکستان اور دین اور سیاست

حنیف رامے (مرحوم) نے پرویزؔ صاحب سے ایک خصوصی انٹرویو لیا تھا جس کی روئیداد انہوں نے اپنے جریدہ ماہنامہ نصرت لاہور میں شائع کرنے کے لئے مرتب کی تھی۔ آج مکرّر اس انٹرویو کے دوسرے حصہ کو قارئین طلوع اسلام کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ (طلوع اسلام)

حنیف: پرویز صاحب! آپ نے میرے پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ اسلام کی اصطلاح بہت مبہم ہو چکی ہے اور اس کا آپ کے نزدیک یہ حل ہے کہ ہم قرآن حکیم کو اپنے لئے حکم سمجھیں، اس سے ہمیں ایک ایسا نقطہ یا مرکز مل جائے گا جس پر حسن اتفاق سے سب کا ایمان ہے اور جس پر تاریخ نے کوئی تحریفی اثر نہیں ڈالا۔ لیکن باوجود اس خواہش کے کہ میں اس مقام پر آپ کو کسی اختلافی بحث میں نہیں الجھانا چاہتا مجھے یہ کہنا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی زندگی جسے خود قرآن کریم نے ہمارے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے اور ایک حد تک ہمارے لئے اپنے اوراق میں محفوظ بھی کر دیا ہے، قرآن حکیم کے ساتھ ساتھ اسلام کی اصطلاح پر روشنی نہیں ڈالتی؟ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ کی زندگی کے بارے میں بھی اگر ہمیں قرآن ہی سے روشنی مل جاتی ہے تو پھر حکم تو قرآن ہی ٹھہرا۔ لیکن کیا ایک جیتا جاگتا رسول، ایک عبد اور بشر، ایک سربراہ مملکت، ایک سپہ سالار، وحی کا حامل، وحی کا مبلغ اور وحی کا نافذ کرنے والا ایک نبی اسلام کا ایک بنیادی ستون نہیں؟ اور کیا قرآن حکیم اور نبیٔ کریم ﷺ مل کر اسلام کے تصور کو معین اور واضح نہیں کر دیتے؟

پرویز: قرآن حکیم کی رو سے رسول کا فریضہ محض ایک ایلچی یا ڈاکیہ کا نہیں ہوتا کہ خدا کا پیغام انسانوں تک پہنچا دیا اور بس۔ اس کے ساتھ اس کا فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ ان اصولوں پر عمل کر کے ان سے ایک معاشرہ متشکل کرے اور یوں دنیا کو دکھا دے کہ یہ اصول ناممکن العمل نہیں۔ قرآن کریم نے اسی لئے نبیٔ کریم ﷺ کی حیات طیبہ کا اہم ترین حصہ اپنے دامن میں ابدی طور پر محفوظ کر دیا تاکہ آنے والے انسانوں کو یہ معلوم ہو کہ ان اصولوں پر عمل بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حضورؐ نے قرآن کریم کے الفاظ میں اپنے بشر ہونے کو نمایاں طور پر بیان کیا جس سے مقصد اس حقیقت کو واضح کرنا تھا کہ حضورؐ یہ کچھ ایک نبی کی حیثیت سے نہیں کر رہے تھے۔ اس لئے کہ اگر یہ کچھ ایک نبی ہی کر سکتا تھا تو پھر حضور ﷺ کی سیرت نوع انسان کے لئے اسوۂ حسنہ قرار نہیں پا سکتی تھی۔

پھر قرآن کریم نے خود نبیٔ اکرم ﷺ کو یہ حکم دیا تھا کہ: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ۔ معاملات میں اپنی امت کے افراد کے ساتھ مشورہ کیا کرو اور یہ ظاہر ہے کہ جماعت مومنین کے یہ افراد انسان ہی تھے' فوق البشر نہیں تھے۔ لہٰذا قرآن کریم کے پیش کردہ نقشے کے مطابق اسلام کا جو نظام محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے قائم کر کے دکھایا وہ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے والے افراد کا کارنامہ تھا اور یہی چیز ہمارے لئے نمونہ بنتی ہے۔ بنابریں اسلامی معاشرے کی تشکیل میں اس اسوۂ حسنہ کو نظرانداز کس طرح کیا جا سکتا ہے' اس کا تو خود قرآن نے حکم دیا ہے۔ قرآن کریم میں اسلام کا تصور مکمل طور پر موجود ہے لیکن حروف کی شکل میں۔ اس تصور کو عملی شکل میں سب سے پہلے نبیٔ اکرمؐ اور جماعت مومنین نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہ تصور اپنی جگہ مکمل' واضح اور غیر متبدل ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی یا اضافہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس پر عمل اپنے اپنے زمانے میں ہوتا چلا جائے گا۔ اسی کو خلافت علیٰ منہاج نبوت کہتے ہیں جو آج بھی قائم ہو سکتی ہے۔

اب میں آپ کے اصلی سوال کی طرف آتا ہوں۔ ہم نے یہ دیکھ لیا کہ اسلام سے مفہوم ہے زندگی کا وہ عملی نظام جو قرآن کریم میں دیئے ہوئے نقشے کے مطابق متشکل ہو۔ اب لیجئے ''جمہوریت'' کو' میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جو لوگ اس اصطلاح کو اس شدومد سے استعمال کرتے ہیں ان کے پیش نظر جمہوریت نہیں بلکہ جمہوریت کی مشینری ہوتی ہے۔ جمہوریت کی مغربی اصطلاح سے مفہوم یہ ہے کہ:

''قانون سازی کا مطلق حق قوم کو حاصل ہے۔''

اور اس کی مشینری سے مراد ہے وہ طریق کار جس کے مطابق قوم اپنا یہ حق استعمال کرتی ہے۔ مثلاً طریق انتخاب' پارلیمانی یا صدارتی نظام' حزب موافق و مخالف کا وجود' وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک مغربی جمہوریت کے مندرجہ بالا اصول کا تعلق ہے یہ اسلام کے اصول حکمرانی کے یکسر خلاف ہے۔ اسلام میں قانون سازی کا مطلق حق کسی کو بھی حاصل نہیں۔ نہ سلطان کو' نہ کسی ڈکٹیٹر کو نہ قوم کو' نہ اس کے نمائندگان کو' نہ پارلیمان کو' نہ صدر مملکت کو۔ یہ حق ان غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے استعمال کیا جا سکتا ہے جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں اور جن میں ردوبدل کا اختیار کسی کو بھی حاصل نہیں۔ جو قانون ان اصولوں سے ٹکرائے گا' وہ قوم کے نمائندگان کی کثرت آراء سے تو ایک طرف' اگر ساری قوم کے اتفاق رائے سے بھی مرتب ہوا ہوگا تو بھی اسلامی نظام میں مردود قرار پائے گا۔

اب رہا جمہوری مشینری کا سوال۔ سو اس کی جزئیات میں سے جو شق قرآنی تعلیم سے متصادم نہیں ہوگی اسے اختیار کیا جا سکے گا۔ جو اس کے خلاف ہوگی اسے مسترد کر دیا جائے گا۔ قرآن کریم کی واضح تعلیم کی رو سے مذہبی فرقوں کا وجود شرک (30:31) اور سیاسی پارٹیوں کا وجود سیاست فرعونی کی ایجاد (28:4)۔ لہٰذا امت کی مجلس مشاورت میں حزب اقتدار اور حزب مخالف کا وجود قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ امت مسلمہ غیر مسلموں کے مقابلے میں خود ایک پارٹی ہے جسے قرآن نے حزب اللہ کہہ کر پکارا ہے اور اس کے مخالف گروہ کو حزب الشیطان۔ قرآن کریم میں انہی دو گروہوں کا ذکر ہے۔

امت اپنے منتخب افراد پر مشتمل مجلس مشاورت (پارلیمان) مرتب کرے گی تاکہ وہ سوچیں اور فیصلہ کریں کہ قرآن کریم کے قوانین کو عملاً کس طرح نافذ کیا جائے۔ یہ ان تمام افراد کا مشترکہ مقصد زندگی ہوگا اس لئے اس میں پارٹیوں کا سوال کیا؟ پیش آمدہ معاملے کے متعلق ہر شخص اپنی اپنی رائے پیش کرے گا۔ ان آراء میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ اس اختلاف کے معنی ہیں معاملے کے مختلف گوشوں کا سامنے آنا تاکہ فیصلے تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ اس کے بعد جو فیصلہ ہوگا اس کی عملی تنفیذ اس پوری جماعت کا متحدہ فریضہ ہوگا۔ اس نظام میں نہ کسی پارٹی کو اقتدار حاصل ہوتا ہے نہ ان کے سامنے مختلف اصول ہوسکتے ہیں جن کی بنا پر جماعت مختلف پارٹیوں میں بٹ جائے۔ اقتدار قرآن کا اور اس کی عملی تشکیل کی ذمہ دار پوری کی پوری جماعت مومنین کی۔ یہ ہے ''اسلامی نظام جمہوریت''۔

حنیف: پرویز صاحب! قرآن میں قومی مسائل کے ضمن میں باہمی مشورے کا حکم دیا گیا ہے۔ جمہوریت کا نظام بھی اس مشورے کی ایک کوشش ہے۔ جو لوگ مروجہ جمہوریت کو اسلام کی رو سے جائز قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ اس کے لئے اسی مشورے والے خدائی حکم سے تائید لاتے ہیں۔ آپ نے اس ملک میں رائج رہنے والی پارلیمانی جمہوریت کی کارفرمائیاں بھی دیکھی ہیں اور جمہوریت کے ایک نئے تجربے بنیادی جمہوریت کا مطالعہ بھی کیا ہوگا۔ کیا اس نئے تجربے میں آپ کو یہ گنجائش نظر نہیں آتی کہ اس ذریعے سے ہم پارٹیوں سے ہٹ کر مشورے کے حکم پر عمل کرنے کے قابل ہوسکتے تھے۔ اس سوال کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ کیا سیاسی فضا کی موجودہ دھندلاہٹ اس بات کا نتیجہ نہیں کہ ایک طرف تو ہم بنیادی جمہوریت کے بلا پارٹی نظام سے کام لینا چاہتے ہیں اور دوسری طرف ہم نے سیاسی جماعتوں کو بھی کھل کھیلنے کا موقع دے رکھا ہے جو مروجہ جمہوریت کی بنیادی کل ہیں۔

پرویز: جب میں نے 1962ء کے دستور میں دیکھا کہ امت میں سیاسی پارٹیوں' یا مذہبی فرقہ بندیوں کی گنجائش نہیں رکھی گئی تو میں نے قرآن کے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے اسے خدا کی رحمت سمجھا اس لئے کہ میرے نزدیک قرون اول کے بعد مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک قدم قرآن کی معین کردہ منزل کی طرف اٹھا تھا۔ پارٹیوں کو ختم کر کے بنیادی جمہوریت کا نظام درحقیقت مشاورت کی ایک تنظیمی شکل تھی جس میں سب سے نیچے سے شروع ہوکر درجہ بدرجہ اوپر تک اٹھتے چلے جاتے تھے۔ یہ طریق مفید ہوسکتا تھا۔ لیکن شاید ہمارے جرائم کی سزا کی مدت ابھی تک ختم نہ ہوئی تھی اس لئے تھوڑے ہی عرصے کے بعد پھر سے دستور میں سیاسی پارٹیوں اور مذہبی فرقہ بندیوں کی گنجائش رکھ دی گئی۔ میں نے ابھی ابھی آپ کے سامنے قرآن کریم کی وہ آیہ جلیلہ پیش کی ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ اگر تم اس کتاب کے ایک حصے کو صحیح مانتے ہو اور دوسرے سے انکار کرتے ہو تو یاد رکھو اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوگا کہ جس حصے کو تم نے صحیح مانا ہے اس کے خوشگوار نتائج حاصل ہو جائیں گے۔ بالکل نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہیں اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلت وخواری نصیب ہوگی اور آخرت کی زندگی میں بھی عذاب ہی ملے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی جمہوریت کی تنظیم کے جو اچھے نتائج متوقع ہوسکتے تھے وہ ''پارٹی ساز

جمہوریت'' کی گرد میں گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ میں نے اس باب میں' حنیف صاحب! کئی مرتبہ کہا ہے کہ ہمیں ایک مرتبہ بیٹھ کر فیصلہ کر لینا چاہئے کہ اگر ہم یہاں اسلامی نظام کا قیام چاہتے ہیں' یعنی وہ نظام جس کے لئے پاکستان مانگا گیا تھا اور حاصل کیا گیا تھا۔۔۔تو ہمیں اسی نظام کو خالصتاً نافذ کرنا ہوگا لیکن اگر ہم اپنے میں اس کی ہمت نہیں پاتے تو پھر ہمیں کھلے بندوں مغرب کا سیکولر نظام قبول کر لینا چاہئے تا کہ معاملہ یکسو تو ہو۔ یہ گومگو کی زندگی۔۔۔ یہ منکر مے بودن و ہمرنگ مستاں زیستن کا انداز۔۔تو عذاب الیم ہے۔قرآن کریم نے جہاں یہ کہا ہے کہ اسلامی طرز زندگی بڑے حسین نتائج پیدا کرتی ہے وہاں اس نے یہ بھی کہا ہے کہ خالص کفر بھی کچھ نہ کچھ اپنے نتائج پیدا کرتا ہے' اگرچہ وہ نتائج بڑے ناپائیدار ہوتے ہیں اور ان کا مستقبل بڑا تاریک ہوتا ہے۔لیکن منافقت کو' جس میں نہ تو اسلام کو دل سے قبول کیا جائے اور نہ کفر کو علانیہ اختیار کرنے کی ہمت ہو' اس نے بدترین طرز زندگی قرار دیا ہے اسی لئے اس نے کہا ہے کہ جہنم کے سب سے نچلے درجہ میں کافر نہیں بلکہ منافق ہوں گے۔

میں اتنا واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت جس غیر اسلامی معاشرے کے اندر ہم زندگی بسر کر رہے ہیں وہاں سے اسلامی معاشرے کے نصب العین تک ہم تدریجاً ہی جا سکتے ہیں۔اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس نصب العین کو واضح طور پر معین کر کے اسے مملکت پاکستان کی بنیاد قرار دیں اور اس کے بعد ایسا طریق کار اختیار کریں جس سے ہم رفتہ رفتہ اس نصب العین تک جا پہنچیں۔ یہ ہے میرے نزدیک فلاح کی راہ۔

حنیف: نارتھروپ نے اپنی تازہ کتاب ''فلسفیانہ انسانیت اور سیاست حاضرہ'' میں کلکھون اور سارو کن کی تحقیقات کی روشنی میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ مختلف اقوام کے قوانین اور عمل کے قالب ان کے فلسفۂ حیات سے پھوٹتے ہیں۔خواہ وہ شعوری طور پر اس فلسفے سے واقف ہوں یا نہ ہوں۔ ہر قوم زندگی کے تجربات کو تصورات میں ڈھالتی ہے اور یہی تصورات اس کے سیاسی' معاشرتی اور معاشی اداروں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ہمارے لئے قرآن عظیم کی صورت میں کائنات' انسان اور ملت اسلامیہ کے بارے میں واضح تصورات موجود تھے۔لیکن جب ہم اپنے سیاسی' معاشرتی اور معاشی قالبوں کو دیکھتے ہیں تو یا قرآن کی تعلیم پر شک گزرتا ہے یا یہ خیال آتا ہے کہ ہم قرآن کو سمجھتے ہی نہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بعض لوگ بڑے خلوص کے ساتھ یہ احساس رکھتے ہیں کہ اسلام کی مروجہ تعلیم اور اس کے تحت قائم ہونے والا تصور ذات باری' تصور دعاء' تصور انصاف ہمارے کسی کام نہیں آ سکتا۔اس سے جو حالتیں ابھر سکتی تھیں وہ ابھر چکی ہیں اور اگر ہمیں بہتر نتائج کی توقع ہے تو ہمیں اسلام کی تعلیم کے بارے میں اپنے تصورات پر نظر ڈالنی ہوگی کہ وہ کس حد تک صحیح بنیادوں پر استوار ہے؟

مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ اگر ہم نے قرآن کی تعلیم کو سمجھنے میں کوتاہی کی ہے تو کیا کوئی ایسا راستہ نہیں جس پر چلتے ہوئے ہم اس منزل تک پہنچ جائیں جہاں ہمارے بنیادی تصورات کا سرچشمہ قرآن قرار پائے اور کیا یہ راستہ لازمی طور پر ان پتھروں سے پٹا ہوا ہے جو ہم گالیوں اور کفر کے فتوؤں کی صورت میں ہر مصلح دین پر اٹھاتے رہے ہیں۔۔۔ یہاں تک کہ ہم نے یہاں سرسیدؒ اور اقبالؒ کو بھی اس انعام سے نوازا۔

پرویز: یہ درست ہے کہ بنیادی تصورات ہی وہ سرچشمہ ہیں جس سے کسی قوم کا تمدن اور کلچر جنم لیتا ہے۔ دین ایسے تصورات عطا کرتا ہے جن سے ایک انسانیت ساز معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ قرآن کریم نے ایسے ہی تصورات دیئے تھے۔ لیکن دین کے تصورات مفاد پرست گروہوں کے لئے پیغام مرگ ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی ہر ممکن کوشش ہوتی ہے کہ یہ تصورات مٹا دیئے جائیں۔ اس کے لئے ایک بڑی گہری سازش وجود میں آتی ہے اور مذہبی پیشوائیت آگے بڑھتی ہے۔ جب فرعون دیکھتا ہے کہ میں صاحب ضرب کلیم کا حریف نہیں ہوسکتا تو وہ ہامان کو مدد کے لئے بلاتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت کرتی یہ ہے کہ بنیادی تصورات کے الفاظ کو تو اس طرح رہنے دیتی ہے لیکن ان کا مفہوم یکسر بدل دیتی ہے۔ اس سے وہ تصورات اصل دین کی ممی شدہ لاشیں بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ان سے ملتے جلتے کچھ اور الفاظ تراشتی ہے اور ان پر تقدس کا غلاف چڑھا کر انہیں بھی خدائی تصورات کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ عوام سمجھتے ہیں کہ ہم ان تصورات کے حامل ہیں جو دین نے عطا کئے تھے لیکن درحقیقت وہ ان تصورات کی قبروں کے مجاور بن کر رہ جاتے ہیں۔ دیگر مذاہب کی طرح اسلام کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا ہماری پوزیشن اس لحاظ سے ان سے مختلف ہے کہ ہمارے پاس وہ کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود ہے جس نے ان تصورات کو پیش بھی کیا تھا اور ان کا مفہوم بھی خود ہی معین کر دیا تھا۔ ہمارے لئے کرنے کا کام اتنا ہے کہ ہم ان تصورات کا مفہوم قرآن کریم سے معین کر لیں اور ان کے غیر قرآنی مفہوم کو جھٹک کر الگ کر دیں۔ اس سے دین کے اصل تصورات ہمیں پھر سے وہ توانائی عطا کر دیں گے جو نہ صرف ہمیں خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے ہمکنار کر دے گی بلکہ دنیا میں ایک عالمگیر انسانیت نواز انقلاب پیدا کر دے گی۔

لیکن اس میں دشواری یہ ہے کہ مفاد پرست گروہ چاہتے ہی نہیں کہ ایسا ہو اس لئے وہ مذہب پرستی کے لبادے میں ہر ایسی کوشش سے ٹکرا جاتے ہیں اور جو شخص ایسا کرنے کا ارادہ کرتا ہے اسے اپنے کفر کے فتوؤں سے نوازتے ہیں۔

جو لوگ اسلامی تصورات کو ایک چلا ہوا کارتوس قرار دیتے ہیں ان کے سامنے اسلامی تصورات نہیں بلکہ مفاد پرست گروہوں کے تراشیدہ تصورات ہوتے ہیں جن پر اسلامی ٹھپا لگا دیا گیا ہے۔ اگر ان کے سامنے دین کے اصلی تصورات اور ان کا صحیح مفہوم آجائے تو وہ دیکھیں گے کہ یہ تصورات کس قسم کا حیات بخش نظام پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلام کے سب سے بنیادی تصور لا الٰہ الا اللہ کو لیجئے۔ اس کا قرآنی مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں کوئی قانون ایسا نہیں جس کے سامنے انسان اپنا سر جھکائے۔ کوئی ایسی ہستی نہیں جس کی محکومی اختیار کی جائے۔ اسے صرف قانون خداوندی کی اطاعت کرنی چاہئے۔ یہ تصور جس قدر عظیم انقلاب کی بنیاد ہوسکتا ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جب ''الٰہ'' کے معنی پرستیدہ اور عبادت کے معنی پرستش کر لئے جائیں تو اس سے جذبات کی حد تک تو ہم تسکین پا سکتے ہیں' اس تصور کا عملی طور پر زندگی سے کوئی واضح تعلق نہیں رہتا۔ قرآن کا کام درحقیقت مذہب کے تراشیدہ تصورات کو خدا کے عطا کردہ تصورات سے بدلنے کا ہے۔ اس کے لئے کوئی ایسا طریقہ نظر نہیں آتا جس سے ہم ان پتھروں سے بھی بچ جائیں جن سے ہر مصلح کا راستہ پٹا پڑا ہے اور انسانوں

کے خودساختہ تصورات کو قرآنی تصورات سے بھی بدل دیں۔

میرے عزیز بھائی! میرے نزدیک' یا یوں کہئے کہ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں' اس کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوسکتا۔ یہ دنیا کے ہر فرعون' ہر ہامان اور ہر قارون سے جنگ مول لینا ہے۔ اور یہ جنگ ایسی ہے جس میں مفاہمت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جب تک ہم لا الٰہ نہیں کہتے الا اللہ پر آ ہی نہیں سکتے۔ یہی انبیاء کا راستہ تھا اور یہی راستہ ہر اس شخص کو اختیار کرنا ہوگا جو اس قسم کا ارادہ رکھتا ہے۔ لا الٰہ میں ہر غیر خداوندی بت کو پاش پاش کرنا ہوگا اور ظاہر ہے کہ ان بتوں کے پجاری اپنے معبودوں کو نیست و نابود ہوتے کس طرح دیکھ سکتے ہیں۔

حنیف: قرآن حکیم نے ایک جگہ کہا ہے:

''کیا تمہیں یہ گمان ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور تمہیں وہ کچھ پیش نہ آئے گا جو تم سے پہلوں کو پیش آیا۔ انہیں مصائب و آلام نے گھیر لیا اور وہ طوفانِ حوادث میں یوں تھپیڑے کھاتے رہے کہ نبی اور اس کے رفقاء پکار اٹھے کہ اے اللہ! تیری نصرت کب آئے گی۔'' (2:214)۔

خداوند کریم نے ایمان کے ساتھ ساتھ عمل صالح کے ذکر کا جو التزام برتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ قرآن نے آزمائش و ابتلاء کو مومن کی زندگی کا لازمہ گردانا ہے۔ جن لوگوں کے دل میں یہ درد پیدا ہوا کہ ہم نے اسلام کی آسان تعلیم کو سمجھنے میں غلطی کی ہے انہوں نے میرے خیال میں یہ احتیاط نہیں برتی کہ کہیں اس شوق تسہیل (Over Simplification) کے فطری نتیجے کے باعث اپنے مقتدیوں کو اس راہ پر ڈال دیں کہ وہ راہ حق ہی کو آسان سمجھ بیٹھیں۔ تعلیم کے بارے میں تو قرآن نے خود بہت تاکید سے اپنے یسر یا آسان ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن اس سے عمل کی کٹھنائیاں تو کم نہیں ہو جاتیں۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ تعلیم کو مشکل بنانے کے عمل کے ساتھ ساتھ تعلیم کے سلسلے میں۔۔۔ (Over Simplification) بھی اسلام کے ساتھ زیادتی ہے۔ چنانچہ میں نے ایسے گھرانوں کو اسلامی شعائر کی بڑے اعتماد سے توہین کرتے دیکھا جس میں قرآن کے یسر ہونے کا غلط تصور پیدا ہو گیا ہے۔ انہیں صوم و صلوٰۃ جیسے احکامات میں وقت کا اور خیرات میں مال کا زیاں محسوس ہوتا ہے۔ ادھر عملی سطح پر وہ دو تقریریں اور چار پمفلٹ پڑھ کر اسے تدبر اور تعقل کی معراج سمجھتے ہوئے دوسرے تمام مسلمانوں کو بے علم بلکہ گمراہ گردانے پر مائل ہو جاتے ہیں۔ ان کی حالت کچھ ایسی ہے جیسے ایک نسل پیشتر ان لوگوں کی تھی جو کمیونزم سے متاثر ہوئے تھے۔ یہ لوگ بحث تو مارکس کا نام لے لے کر کرتے تھے حالانکہ داس کیپیٹال کے درشن بھی انہیں نصیب نہ ہوئے تھے مگر نقد علم کمیونزم پر چند مفت بٹنے والے کتابچوں پر مبنی تھا۔

پرویز: غلط روش پر چلنے والی قومیں ہمیشہ افراط و تفریط کے جھولے جھلاتی رہتی ہیں۔ یہی کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔ ہمارے یہاں پہلے قرآن کریم کو ایسا مشکل بتایا گیا کہ اس کا سمجھنا ''گیت و دیا'' سے کم مشکل نہ تھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ قرآن کے الفاظ کی تلاوت حصول ثواب کے لئے کافی سمجھ لی گئی اور حصول جنت کو اس قدر آسان بنا دیا کہ اس کے لئے کچھ کرنے کی

ضرورت ہی نہ پڑے۔ اس کے لئے اس قسم کی روایات وضع کر لی گئیں کہ ''جب دو مسلمان مصافحہ کرتے ہیں تو ان دونوں کے جدا ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ انہیں بخش دیتا ہے''۔ (ابوداؤد)۔ اور طاعون یا اسہال سے یا ڈوب کر مرنے سے شہادت کا درجہ عطا ہو جاتا ہے (نسائی)۔ اب جھولا نیچے آیا تو قرآن کریم کے سمجھنے کے لئے اتنے سے غور و فکر کی ضرورت بھی نہ سمجھی گئی جتنی مثلاً شیکسپیئر کے سمجھنے کے لئے۔ باقی رہا عمل سو اس کے لئے یہ برہموسماجی عقیدہ اپنا لیا گیا کہ اصل بات ''نیک عملی'' ہے۔ جس عمل کو کوئی نیک سمجھے اسے کر لیا کرے۔ اللہ اللہ خیر سلاّ۔

دین ایک عالم گیر انقلاب کا داعی ہے جس کے لئے بڑی بڑی قوتوں سے ٹکر لینی ناگزیر ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے بڑی ہی مجاہدانہ حرارت کی ضرورت ہے۔ میرے نزدیک کرنے کا کام یہ ہے کہ دین کے صحیح انقلاب آفرین تصورات واضح اور معین شکل میں معاشرے کے سامنے رکھ دیئے جائیں اور اسے بتا دیا جائے کہ اس راہ میں کتنے خطرناک مقامات آتے ہیں لیکن اس کی منزل کس قدر حسین اور تابندہ ہے۔ اس کے بعد افراد معاشرہ سے کہہ دیا جائے کہ یہ سب کچھ سوچنے اور سمجھنے کے بعد اپنے لئے فیصلہ کیجئے کہ دین کی راہ اختیار کی جائے گی یا نہیں۔ یونہی سراب آسا تخیلات کے ماتحت زندگی بسر کر کے نہ اپنے آپ کو دھوکا دیجئے نہ دین کو۔ نہ خود ذلیل ہو جیئے نہ اسلام کو بدنام کیجئے۔

حنیف: پرویز صاحب! میں آپ سے ایک ذاتی سوال پوچھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ آپ نے برسہا برس تصنیف و تالیف کے ذریعے سے اور اپنے درس کے سلسلے کی وساطت سے لوگوں کے سامنے اپنے خیال کے مطابق دینی تصورات کی صحیح شکل رکھنے کی کوشش کی ہے۔ کیا آپ نے یہ محسوس نہیں کیا ہے کہ آپ کی اس کوشش نے' کہ دین کے اس بنیادی تصورات کو لوگوں کے سامنے پیش کر دیا جائے' بعض لوگوں میں یہ جھوٹا اعتماد پیدا کر دیا ہے گویا وہ اسلام کی کنہ تک پہنچ گئے ہوں۔ کیا آپ کے مشاہدے میں یہ بات نہیں آئی کہ آپ کے چند پمفلٹ پڑھ کر یا چند تقریریں سن کر اور ان سے متاثر ہو کر بعض لوگ اپنے ہمسایوں سے اس انداز میں بحث مباحثہ کرنے چل دیتے ہیں کہ انہوں نے تو دین کی روح کو پا لیا ہے اور باقی سب گمراہ ہیں۔

پرویز: حنیف صاحب! میں نے شروع ہی سے اس قسم کے خدشات کو بھانپ لیا تھا اور اسی لئے میں نے آج تک کوئی جماعت نہیں بنائی۔ میں اپنی قرآنی فکر کو فضا میں بکھیرتا چلا جاتا ہوں اور اس سے مختلف مقامات پر مختلف نتائج پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ اختلاف قارئین اور سامعین کے اختلاف مقاصد کا نتیجہ ہے۔ بعض لوگوں کا مقصد اپنی پندار (اَنا) کی تسکین سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ انہوں نے میری تعلیم سے ایسی باتیں لے لیں جن سے انہوں نے سمجھ لیا کہ وہ اپنے ہم عصروں پر اپنے علم وفضیلت کی دھاک بٹھا سکتے ہیں۔ یہی ان کا مقصد تھا' یہ انہوں نے پا لیا۔ لیکن اس گروہ میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے اندر میری فکر نے طالب علمانہ جذبے کو ابھارا ہے۔ وہ حقائق کو از خود سمجھنے کے لئے انتہائی محنت کرتے ہیں لیکن ان کے طالب علمانہ عجز کا یہ عالم ہے کہ ان پر نیوٹن کے اس مقولے کا اطلاق ہوتا ہے:

''ہم علم کے سمندر کے کنارے بچوں کی طرح سیپیاں اور گھونگے چن رہے ہیں۔''

لیکن میری کوششوں کا حاصل اس سے بڑھ کر ایک اور ہے اور وہ یہ کہ اب فضا میں قرآن کی آواز عام ہو رہی ہے حتیٰ کہ اپنے تو ایک طرف، مجھے گالیاں دینے والے بھی مجبور ہو رہے ہیں کہ اپنے سامعین کے سامنے کچھ خدا لگتی باتیں کیا کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تبدیلی ایک اچھے انقلاب کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔

حنیف: پرویز صاحب! مجھے تسلیم ہے کہ قرآن حکیم میں بہت گہرے اور ہمہ گیر معانی پائے جاتے ہیں۔ لیکن غور کرنے پر بعض تصورات کی حد تک روایتی توجیہات بھی درست معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً میرے خیال میں صلوٰۃ کا ہرگز اتنا مفہوم نہیں ہے کہ چند رکعت نماز ادا کر لی جائے لیکن جب صلوٰۃ کے وسیع تر معانی پیش کرنے پر زور دیا جاتا ہے تو بعض اوقات یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ دو رکعت والی نماز سے انسان بالکل غافل ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کیا آپ کے فکر نے بھی بعض اس طرح کے نتائج پیدا نہیں کئے؟

پرویز: حنیف صاحب! دین میرے نزدیک زندگی کے ایک عملی نظام کا نام ہے اور جہاں تک ان ارکان اسلام کا تعلق ہے جن کی سند قرآن کریم سے ملتی ہے وہ اس نظام کے ستون ہیں، یا یوں کہئے کہ اس کے پروگرام کے لاینفک اجزا ہیں۔ اگر وہ دین کے نظام کے تحت ادا ہوں تو ان کے حسین نتائج سامنے آتے ہیں اور اس طرح ان کا صحیح مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے اور ان کی اہمیت بھی۔

لیکن جب دین کا نظام باقی نہ رہے تو پھر ارکان کی شکل وصورت تو باقی رہ جاتی ہے، ان کی روح باقی نہیں رہتی۔ میرا پیغام یہ ہے کہ ان ارکان کو پھر سے دین کا جز بنایا جائے تاکہ ان سے وہی نتائج مرتب ہوں جن کے لئے انہیں تجویز کیا گیا تھا۔ جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے میں موجودہ حالات میں بھی، جب کہ وہ نظام موجود نہیں، ان ارکان کو اسی شکل میں قائم رکھنے کے حق میں ہوں اور اس کی تاکید بھی کرتا رہتا ہوں۔ اس لئے کہ ہم میں جب بھی احساس زیاں بیدار ہوا، انہی ارکان کے ''حشر اجساد'' سے ہمیں حیات نو عطا ہو گی۔ لیکن اگر کوئی شخص ان کی پابندی نہیں کرتا تو اس پر میرا کوئی جبر نہیں۔ حقیقت یہ ہے حنیف صاحب! میں نے اپنی پوزیشن صرف ایک مبلغ کی رکھی ہے، داعی یا کسی جماعت کے امام کی نہیں رکھی۔ اس کے ساتھ ہی میں اس سے بھی متفق نہیں ہو سکتا کہ چونکہ دین کے صحیح تصورات پیش کرنے سے لوگوں کی نظروں میں ان بے روح رسومات کی اہمیت کم ہونے کا خدشہ ہے اس لئے دین کی صحیح شکل سامنے لانی ہی نہیں چاہئے۔ میرے ''حلقۂ سخن'' میں ایسے ارباب فکر وعمل بھی موجود ہیں جو ان ارکان کی پابندی علیٰ وجہ البصیرت کرتے ہیں اور اس حقیقت کو محسوس کرتے ہیں کہ جب یہ ارکان اسلام کے نظام کے اجزا بنے تو ان سے کس قدر خوشگوار نتائج مرتب ہوں گے۔

حنیف: قرآن حکیم نے ایمان کو عمل پر اولیت دی ہے۔ عمل کی اہمیت کو اس نے بے شک بے حد اجاگر کیا ہے، لیکن عمل صالح کا سرچشمہ ایمان ہی کو قرار دیا ہے اور ایمان انسان کا اجتماعی مسئلہ نہیں ذاتی مسئلہ ہے۔ ہمارا عمل بے شک اجتماعی قالبوں میں ڈھل سکتا ہے لیکن ایمان ہم اپنے اندر اتر کر ہی لا سکتے ہیں، یہ نہ تو خوف سے پیدا ہوتا ہے، نہ جبر سے، نہ معاشرے کی ملامت

سے، نہ تقلید سے۔ اس نظر سے دیکھیں تو فرد کی اہمیت اداروں سے اولین ہے۔ لیکن آج کل ایک انداز فکر یہ ابھر رہا ہے کہ اداروں کی تشکیل پر زور دیا جاتا ہے اور معاشرے کی اہمیت کو اتنا بڑھایا چڑھایا جاتا ہے کہ خدا کے ساتھ اس کے شریک ٹھہرنے میں شاید ہی کوئی کسر رہ جاتی ہو۔

اس انداز فکر کا ایک مظہر یہ ہے کہ سارا زور اس بات پر دیا جاتا ہے کہ افراد کو معاشرتی قوانین میں جکڑنے کے لئے دھڑا دھڑ قانون سازی کی جائے، چنانچہ ملک میں سیاست کا بازار اس بہانے گرم کیا جاتا ہے کہ قانون ساز اداروں کے لئے چناؤ ہو گا۔ پھر ملک بھر کے بے خبر، بے درد، اور غیر ذمہ دار لوگوں کو قانون سازی کے اعزاز میں دھڑے بندیوں، مفاد پرستیوں اور دھاندلیوں کی کھلی چھٹی دے دی جاتی ہے۔ بحثیں ہوتی ہیں کہ اسلامی قانون بن سکتا ہے یا نہیں۔ مناظرے ہوتے ہیں کہ فلاں قانون اسلامی ہے یا نہیں۔ قانون سازی کا یہ تماشا ہمیں یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں دیتا کہ افراد کو اندر سے بدلنے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ قانون کا احترام تو خدا کے خوف سے، اس کے قول فیصل پر ایمان سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ ایمان ہی موجود نہیں تو قوانین کی زنجیریں ریت کے رسوں سے بھی کمزور ثابت ہوں گی۔

Polanyi کا برسوں کا کام Personal Knowledge اس امر پر دال ہے کہ فرد ہی تمام تر معاشرتی ترقی کا سرچشمہ ہے اور علم کا حصول افراد ہی کے ذریعے سے ممکن ہوتا ہے اور پھیلتا ہے۔

اسی طرح قرآن میں قوانین صرف افراد سے متعلق ہیں لیکن اجتماعی مسائل کے لئے اصول دیئے گئے ہیں۔ فرد کے حقوق تو اتنے اہم سمجھے گئے کہ انہیں خدا نے خود متعین کر دیا لیکن معاشرتی معاملات کو اصول بتا کر ان کی تشکیل کو انسانوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔

میں یہ باتیں آپ کے سامنے اس لئے رکھ رہا ہوں کیونکہ آپ کے بارے میں عام احساس یہ ہے کہ آپ معاشرے کی اہمیت پر بہت زور دیتے ہیں۔

میں اس مقام پر آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ انسانی زندگی میں فرد اور معاشرے کے درمیان کیا رشتہ ہے؟ اور کیا فرد کو بدلے بغیر معاشرے کو بدلنا ممکن ہے؟ دوسرے لفظوں میں کیا افراد کو نظر انداز کر کے اداروں کی تشکیل کا جتن گاڑی کو گھوڑے سے پہلے جوتنے کے مترادف نہیں؟

اور کیا: عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۝ (80:1-3) کی آیات معمولی سے معمولی فرد کو بھی پوری اہمیت دینے کا واضح حکم نہیں؟

پرویز: جسے ہم معاشرہ کہتے ہیں وہ افراد ہی کے مجموعے کا نام ہوتا ہے۔ افراد نہ ہوں تو معاشرہ کہاں سے بنے گا؟ اس لئے بنیادی اہمیت افراد ہی کو حاصل ہے۔ صحیح ایمان سے افراد کے اندر جو تبدیلی واقع ہو گی اس کا مظاہرہ معاشرے میں ہو گا۔ افراد کی تعلیم و تربیت اس لئے نہایت ضروری ہے۔

لیکن ہمارے ہاں دین کا تصور ایک اجتماعی نظام کی حیثیت سے ذہنوں سے محو ہو چکا ہے اور ہم نے اسے ''مذہب'' کے مرادف المعنی سمجھ کر اسے انفرادی مسئلہ بنا لیا ہے۔ یعنی خدا اور بندے کا پرائیویٹ تعلق۔ میری بصیرت کے مطابق یہ تصور قرآنی نہیں۔ دین اجتماعی نوعیت کا نظام ہے اس لئے وہ امت کی تشکیل پر زور دیتا ہے۔ اس اہمیت کے پیش نظر میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر زور دیتا ہوں تاکہ دین کا صحیح تصور ان کے سامنے آ سکے۔ میری پیش کردہ فکر میں جو معاشرہ پر زور دیا جاتا ہے تو اس سے یہ مقصد ہے کہ ہم نے دنیا کے سامنے اس حقیقت کو پیش کرنا ہے کہ اگر انسانی ہیئت اجتماعیہ کی بنیاد خدا کی دی ہوئی مستقل اقدار پر ہو تو اس سے محیر العقول انسانیت ساز نتائج مرتب ہوتے ہیں۔۔ اور یہ بات کسی دوسرے اجتماعی نظام سے ممکن نہیں۔ یہی وہ ضرورت ہے جس کے لئے اسلام اپنے لئے ایک الگ مملکت چاہتا ہے' اپنی آزاد حکومت چاہتا ہے۔ میں دین کے اسی تصور کو اجاگر کرنے کے لئے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر زور دیتا ہوں۔ ورنہ اگر دین خدا اور بندے کے پرائیویٹ تعلق ہی کا نام ہو تو اس کے لئے نہ الگ مملکت کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ اپنی آزاد حکومت کی۔

جب دین کے تصورات اور ان کے انسانیت ساز جنت بداماں درخشندہ نتائج کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھ لیا جائے تو اس سے اس ایمان کی ندیاں رواں ہو جاتی ہیں جن کا سرچشمہ قلب انسانی کی گہرائی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز صحیح تعلیم و تربیت ہی سے ممکن ہے۔ لیکن صحیح تعلیم و تربیت تو آنے والی نسل کی ہو سکتی ہے (اس کے لئے میں اٹھارہ برس سے مسلسل کوشش کر رہا ہوں)۔ جن افراد پر ہمارا موجودہ معاشرہ مشتمل ہے وہ موجودہ نہج پر پختہ ہو چکے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس معاشرے میں اسلامی اقدار کو کیسے رائج کیا جائے؟ ظاہر ہے کہ یہ کام قانون کے ذریعے ہی کیا جائے گا۔ اس کے لئے معاشرے میں قرآنی قوانین کا نفاذ کیا جانا ضروری ہے۔

جو لوگ تعلیم و تربیت سے قطع نظر کر کے محض حکومت کے ڈنڈے سے اسلامی معاشرے کی تشکیل چاہتے ہیں وہ میرے نزدیک یہودی شریعت کے تصور کو تو کچھ سمجھتے ہیں لیکن نبی اکرم ﷺ کے معلم ہونے کی حیثیت کو بالکل نہیں سمجھتے۔

اس مقام پر شاید کہہ دیا جائے کہ نبیٔ اکرم ﷺ نے تعلیم و تربیت کے ذریعے سے جماعت کی تشکیل کی تھی قانون کا اعلان ان پر بعد میں کیا گیا تھا لیکن تم موجودہ مسلمانوں پر قانون کا اطلاق ضروری سمجھتے ہو' اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے غیر مسلموں کو مسلمان کیا تھا اور انہیں مسلمان کرنے کا طریقہ تعلیم و تربیت تھا۔ اس لئے اس وقت جو معاشرہ متشکل ہوا تھا وہ تھا ہی ان مسلمانوں پر مشتمل جو تربیت یافتہ تھے۔ لیکن ہمارے ہاں صورت اس کے برعکس ہے۔ یہاں پہلے سے ایک معاشرہ موجود ہے جو مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ مسلمان وہ ہیں جو تعلیم و تربیت کے بعد مسلمان نہیں ہوئے' وہ بس مسلمان ہیں۔ ان کی آئندہ نسل کو تو اسی طرح ''مسلمان کرنا'' چاہئے جس طرح نبی اکرم نے دوسروں کو مسلمان کیا تھا۔ یعنی تعلیم و تربیت کے ذریعے۔۔۔ لیکن موجودہ مسلمانوں کو علیٰ حالہٖ نہیں چھوڑا جا سکتا' انہیں لامحالہ کسی نہ کسی قانون اور ضابطہ کے ماتحت رکھنا ضروری ہے۔ تو وہ قانون اور ضابطہ اسلامی کیوں نہ ہو؟ اس سے بھی بڑی حد تک معاشرتی

اصلاح ہوجائے گی۔

میں اسے پھر واضح کردوں کہ افراد اور معاشرے کا تعلق ایک مشین کے پرزوں اور خود مشین کا تعلق ہے جب تک پرزے صحیح حالت میں نہ ہوں گے مشین صحیح کام نہیں کرے گی۔ لیکن پرزے بھی تو اسی وقت اپنا مقصد پورا کریں گے جب وہ مشین کے اندر فٹ ہوں گے۔ ایک پرزہ اپنی ذات میں کتنا ہی اصلح اور گراں بہا کیوں نہ ہو اگر وہ مشین سے باہر رکھا ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کا عدم وجود برابر ہے' اور مشین کے اندر ایک معمولی سا پیچ بھی اپنا مقام رکھتا ہے اور اپنی زندگی کا مقصد پورا کرتا ہے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

دین کا نظام وہ مشینری ہے جس کے اندر ہر پرزہ (افراد معاشرہ) اپنے اپنے مقام پر اپنا اپنا فریضہ ادا کرتا اور یوں اپنی ہستی کا مقصد بروئے کار لاتا ہے۔ اس مثال میں اس فرق کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ مشین کے پرزے بے جان ٹکڑے ہوتے ہیں جو میکانکی طور پر مصروف نقل وحرکت رہتے ہیں۔ اس کے برعکس افراد معاشرہ ذی حیات اور قابل نشوونما نفوس ہوتے ہیں۔ اس نظام کے اندر ان کی نقل وحرکت بالارادہ ہوتی ہے جس سے خود ان کی صلاحیتوں میں بھی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ یعنی جہاں اسلامی نظام کا مجموعی نتیجہ عالمگیر انسانیت کے لئے سرفرازیوں اور خوشگواریوں کا ضامن ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی اس سے خود افراد معاشرہ کی صلاحیتوں میں بھی جلا پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح اس نظام اجتماعی کے اندر ان افراد کی انفرادیت گم نہیں ہوجاتی بلکہ وہ نہ صرف قائم رہتی ہے بلکہ مستحکم ہوتی چلی جاتی ہے۔ یوں یہ نظام خود ان افراد کی ذات کے استحکام کا موجب بن جاتا ہے۔ یہ چیز دنیا کے کسی اور نظام میں ممکن نہیں۔ دنیا میں جہاں فرد ہوتا ہے وہاں نظام کا تصور نہیں ہوتا۔ (مذاہب عالم میں یہی کیفیت ہوتی ہے) اور جہاں نظام ہوتا ہے وہاں فرد باقی نہیں رہتا (جیسے مغرب کے جماعتی نظاموں میں ہو رہا ہے)۔ یہ خصوصیت اسلامی نظام ہی کی ہے کہ اس میں نظام خود افراد کی ذات کے استحکام کا موجب بنتا ہے۔ فرد اور معاشرے کا یہی وہ تعلق ہے جسے اقبال نے اس حسین انداز میں بیان کیا ہے کہ

زندگی انجمن آراء و نگہدار خود است ایکہ در قافلہ ای باہمہ روبے ہمہ شو

حنیف: خداوند کریم نے قرآن میں انسان کو دعوت دی ہے کہ وہ اس کی آیات کو آفاق وانفس میں تلاش کرے۔ جہاں تک آفاق کا تعلق ہے علوم وفنون کی راہ سے' سمع وبصارت اور ذہن کی راہ سے انسان اس قائم بالحق کائنات میں اللہ کے واضح اور نت کھلتے چلے جانے والے نشانات دیکھتا ہے یا دیکھ سکتا ہے۔ جہاں تک انفس کا تعلق ہے علمی سطح پر نفسیات نے عموماً اور تحلیل نفسی نے خصوصاً کچھ راہیں تراشی ہیں۔ پھر فلسفیوں نے انسانی ذات پر جو کام کیا ہے اس نے کچھ دریچے کھولے ہیں۔ سری آروبندو نے ''حیات ربانی'' میں اور اوسپنسکی نے ''اعجاز کی تلاش'' میں انسان کے اندر بسنے والے جہانوں کی نشاندہی کی ہے۔ ہمارے یہاں اقبالؒ نے مکانِ دروں کے نظریئے سے اس اقلیم کی جانب توجہ دلائی ہے جو عموماً سربستہ رہتی ہے۔

میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا تصوف کی صحیح تعلیم یہی نہیں تھی کہ خدا کی آیات کو انفس میں تلاش کرنے کی راہ ڈھونڈی جائے اور کیا جب تک آفاق کے ساتھ ساتھ انفس میں خدا کی آیات کا وجود نہ نظر آئے یہ ممکن ہے کہ انسانی عمل کو وہ سرچشمہ نصیب ہو جائے جو دل میں خدا پر ایمان لانے ہی سے پھوٹتا ہے؟

آج ہم اضطراب، نامرادی اور سنگدلی کے جو مظاہر اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں کیا ان کی بناء یہ نہیں کہ ہم نے ظاہری تعلیم کے ساتھ ساتھ باطنی تعلیم کو اس کا جائز حق نہیں دیا خصوصاً جبکہ خدا کا حکم موجود ہے کہ گناہ کے ظاہر سے بھی بچو اور اس کے باطن سے بھی بچو؟ بے شک اسلام رہبانیت نہیں سکھاتا اور تصوف کی مروجہ شکلیں رہبانیت بلکہ ویدانت کی گھسی پٹی صورتوں سے ہم آہنگ ہیں لیکن کیا تصوف کا جوہر۔۔یعنی انفس میں خدا کی آیات کی تلاش۔۔ہمارے لئے ان راہوں کو روشن نہیں کر سکتا جو انسان کو لپک کر خدا کا رفیق بن جانے کی رغبت دلاتی ہیں؟

پرویز: تصوف ایک اصطلاح ہے اور جب تک اس کا صحیح مفہوم نہ سمجھ لیا جائے اس کی تائید و تردید میں بات کرنا مفید نہیں ہوگا۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ تصوف یا صوفی کا لفظ نہ قرآن میں ملتا ہے نہ حدیث میں، حتیٰ کہ اس زمانے کے دوسرے لٹریچر میں بھی اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔

اب یہ دیکھئے کہ تصوف ہے کیا؟ قرآن کریم نے بتایا ہے کہ انسانی علم کے ذرائع تجربہ، مشاہدہ اور تفکر ہیں۔ ان سے بلند ایک اور ذریعۂ علم ہے اور وہ ہے وحی۔۔۔جو انبیاء کو ملتی ہے۔۔۔وحی میں نبی کے ذاتی فکر یا تجربے یا مشاہدے، کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ نبی حقیقت کا انکشاف نہیں کرتا، حقیقت خود اپنے آپ کو اس پر منکشف کرتی ہے۔ اس میں معروضیت (Objectivity) بنیادی چیز ہے۔ وحی کا سلسلہ نبیٔ کریم ﷺ کی ذات گرامی پر ختم ہو گیا۔ لہٰذا علم کا یہ ذریعہ اس کے بعد بند ہو گیا۔ اب ہمارے لئے علم کے دو ہی چشمے ہیں۔ ایک قرآن کریم میں بیان کردہ حقائق اور دوسرا ان کے سمجھنے کے لئے انسانی فکر۔ اگر کوئی شخص آج حقیقت کا علم خدا سے براہ راست حاصل کرنے کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ دراصل نبوت کا مدعی ہے۔

تصوف کی بنیاد اس مفروضے پر ہے کہ صوفی حقیقت کا براہ راست علم خدا سے حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ سرخیل صوفیاء شیخ محی الدین ابن عربی کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم حقیقت کا علم اس مقام سے حاصل کرتے ہیں جہاں سے نبی کو علم ملتا تھا۔ یہ تصوف کی وہ بنیاد ہے جو ختم نبوت کی ساری عمارت کو منہدم کر دیتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس کا پتا نشان قرن اولیٰ میں کہیں نہیں ملتا۔ یہ تصور جو ایک بہت بڑی سازش کا پیش خیمہ تھا مسلمانوں میں بہت بعد میں لایا گیا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں ''تصوف اسلام کی سرزمین میں ایک اجنبی پودا ہے''۔

اب آیئے انفس و آفاق والی آیت کی طرف۔ اس کے ایک معانی تو یہ ہیں کہ قرآن جس انقلاب کی نشاندہی کرتا ہے اسلام کی اولیں مخاطب قوم اس کو خود اپنے اندر بھی دیکھے گی اور دیگر اقوام عالم کے اندر بھی۔ لیکن انسان کی مضمر قوتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور ان پر غور و فکر کرنے کے لئے قرآن کریم نے کئی مقامات پر تاکید کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان کی یہ داخلی

مضمر قوتیں کیا ہیں۔ اس کے متعلق کسی مضمر پیچیدگی میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ انفرادی اور جماعتی طور پر ہم ہر روز ان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ تسخیر کائنات کے لئے علم کی قوت، بے پناہ ہمتوں اور قربانیوں کے لئے یقین محکم (ایمان) کی قوت، نظم و ضبط کے تابع کام کرنے والے افراد کی مجموعی قوت، زاویۂ نگاہ کی تبدیلی سے صحیح عمل کی قوت، وغیرہ وغیرہ۔ یہ قوتیں قوانین خداوندی پر عمل کرنے سے ابھرتی ہیں جو قرآن کریم میں دیئے گئے ہیں اور جن کا محسوس مظاہرہ سب سے پہلے محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ کے اسوۂ حسنہ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس کا نام کردار کی بلندی اور سیرت کی پاکیزگی ہے۔ لیکن انسان کی بعض داخلی قوتوں کا ایک فنی پہلو بھی ہے۔ جس طرح ایک پہلوان خاص قسم کی کسرت اور ریاضت سے اپنی جسمانی قوت اتنی بڑھا لیتا ہے کہ وہ عام انسان ہی دکھائی نہیں دیتا اسی طرح خاص مشقوں کے ذریعے سے انسانی قوت ارادی کو اس طرح بڑھایا جاسکتا ہے کہ اس سے بعض ایسی باتیں سرزد ہوتی ہیں جو عام آدمیوں کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ یہ ہندوؤں کی سمادھیوں، مغ بچوں کے آتشکدوں اور عیسائیوں کی خانقاہوں (وغیرہ) میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس کی ایک منجھی ہوئی شکل آج ہمیں ہپناٹزم کی صورت میں ملتی ہے۔ انسان کی یہ قوت خالص فنی چیز ہے جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ بلاتفریق مذہب وملت ہر اس شخص کو حاصل ہوسکتی ہے جو اس قسم کی ریاضتیں اور مشقیں کرے۔ مگر توہم پرستی کی تاریکیوں میں اس کو ''روحانیت کی کرامات'' قرار دے دیا جاتا ہے۔ اسی کو تصوف کا کمال قرار دیا جاتا ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے یہ ایک فنی چیز ہے جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ دین قوانین خداوندی کی اطاعت کا نام ہے جس سے ایک فرد کے اندر حسین وجمیل کردار کی روشنی چمکتی ہے اور ان افراد کے مجموعے سے جو معاشرہ مرتب ہوتا ہے وہ کاروانِ انسانیت کو اس منزل مقصود کی طرف لے جاتا ہے جو شرف وتکریم انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔

قرآن کریم نے نبی اکرم ﷺ کو سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز بتایا ہے (وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ (68:4) اس پر شاہد ہے) صحابۂ کبار رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بھی حسنِ سیرت و بلندیِ کردار ہی کا تذکرہ کیا ہے، ان کی کسی روحانی قوت کا ذکر نہیں کیا۔ اس نے جہاں قوموں کے عروج وزوال کے سلسلے میں یہ ابدی قانون بیان کیا ہے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ (13:11)

خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ اپنے انفس میں تبدیلی نہیں کرتی۔ تو اس سے قوموں کی نفسیاتی تبدیلی مراد ہے۔ تصوف کی رو سے کوئی روحانی تبدیلی مقصود نہیں۔

تصوف تو قوم یا اجتماعی زندگی سے بحث ہی نہیں کرتا۔ قرآن کے لغت میں تصوف کے لئے رہبانیت کا لفظ آیا ہے جسے وہ ذہن انسانی کا خود تراشیدہ مسلک قرار دیتا ہے۔ تصوف کو اسلامی اور غیر اسلامی شقوں میں تقسیم کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اسلامی کمیونزم اور غیر اسلامی کمیونزم کا تصور پیش کرے۔

حنیف: ہمارے یہاں یہ تصور ہے کہ اس سرزمین میں اسلامی تعلیم صوفیاء کرام کی مرہون منت ہے۔ آپ نے فرمایا ہے

کہ تصوف بنیادی طور پر انفرادیت پسند ہے اور اجتماعی معاملات سے اس کا تعلق کم ہوتا ہے۔ لیکن اس اعتبار سے دیکھیں تو تصوف کا اثر ہماری ہیئتِ اجتماعی پر بہت گہرا ہے' بلکہ اہل تصوف نے آگے بڑھ کر معاشرے کو گلے سے لگانے کی کوشش کی ہے۔ پھر اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے بعض مفکرین مثلاً غزالیؒ شیخ احمد سرہندیؒ شاہ ولی اللہؒ اور بعض کے نزدیک اقبالؒ کا بلند پایہ مجتہدین ہوتے ہوئے بھی تصوف سے گہرا رشتہ رہا ہے۔ کیا ان لوگوں کی مثال سے ہم یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے کہ ایک ایسا مقام اتصال بھی اسلام کی تعلیم کے دائرے میں رہتے ہوئے نکل سکتا ہے جہاں شریعت اور تصوف باہم شیر و شکر ہو جائیں۔

پرویز: حنیف صاحب! میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ان حضرات نے درحقیقت کس قسم کا اسلام پھیلایا تھا لیکن جس اسلام کو ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور جو اس وقت ہمارے ہاں رائج ہے وہ وہی اسلام تو ہے جس کا رونا میں اور آپ دونوں بیٹھے رو رہے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ اس اسلام کا بہت گہرا اثر ہماری ہیئتِ اجتماعی پر ہوا ہے اور اسی اثر کو زائل کرنے کے لئے اس قدر کاہش و کاوش کرنی پڑ رہی ہے لیکن وہ پھر بھی زائل نہیں ہو رہا۔

باقی رہی شخصیتیں۔ تو قرآن کریم نے اس باب میں ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ:

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْـَٔلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٣٤﴾ (2:134)

''یہ لوگ اپنے اپنے وقت میں گزر گئے' جو کچھ انہوں نے کیا وہ ان کے لئے ہے اور جو تم کرو گے وہ تمہارے لئے ہوگا۔ اور ہم تم سے یہ کبھی نہیں پوچھیں گے کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔''

لہٰذا میرے نزدیک دین میں سند صرف خدا کی کتاب ہے۔ متقدمین ہوں یا متاخرین' ان میں سے کسی کے جو اقوال و اعمال قرآنی تعلیم کے مطابق ہوں گے انہیں ہم قابل ستائش سمجھیں گے۔ جو اس کے خلاف جائیں گے انہیں ہم مسترد کر دیں گے کہ ہمارے لئے کسوٹی خدا کی کتاب ہے نہ کہ کسی انسان کا فکر و عمل۔

قارئین طلوعِ اسلام توجہ فرمائیں

ماہنامہ طلوعِ اسلام کی درج ذیل سالانہ خوبصورت جلدیں 800 روپے فی جلد کے حساب سے دستیاب ہیں۔ اپنے کتب خانوں میں ''طلوعِ اسلام'' کے فائلز مکمل کرنے کے لئے آرڈر فرمائیے۔ شکریہ

1972، 1975، 1976، 1977، 1983، 1984، 1985، 1986، 1987، 1988، 1991، 1999،
2000، 2001، 2002، 2003، 2004، 2005، 2006، 2011، 2015، 2016، 2017، 2018۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بچوں کا صفحہ

عید میلاد النبی ﷺ

عید میلاد النبی ﷺ کی شام ایک بچے اور اس کی والدہ کے درمیان یہ بات چیت ہوئی۔

بیٹا: ''امی جان! ہمیں بھی موم بتیوں کے بکس منگا دیجئے۔ ہم انہیں رات کو اپنی چھت پر جلائیں گے۔''

ماں: ''بیٹا! موم بتیاں تو میں تمہیں منگا دوں گی لیکن مجھے یہ تو بتاؤ کہ تم انہیں کیوں جلانا چاہتے ہو؟''

بیٹا: ''امی جان! اس میں بھلا پوچھنے کی کیا بات ہے۔ سب لڑکے اپنے اپنے ہاں موم بتیاں جلائیں گے۔ اس لئے ہم بھی جلائیں گے۔''

ماں: ''بیٹا! یہ تو کوئی معقول بات نہ ہوئی کہ چونکہ سب لڑکے ایسا کریں گے اس لئے تم بھی ویسا ہی کرو گے۔ میں نے تمہیں کتنی مرتبہ سمجھایا ہے کہ جو کام کرو خود سمجھ سوچ کر کرو۔ یہ نہیں کہ جو کچھ دوسرے کر رہے ہیں تم بھی بلا سوچے سمجھے وہی کچھ کرنے لگ جاؤ۔ تم خود سوچ کر بتاؤ کہ آج رات موم بتیاں کیوں جلائی جائیں گی۔''

بیٹا: ''امی جان! کہتے ہیں کہ آج ہمارے رسول ﷺ کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس لئے ہم اس خوشی میں روشنی کرتے ہیں اور جشن مناتے ہیں۔''

ماں: ''ٹھیک ہے بیٹا! بات یہی ہے۔ لیکن اس کے بعد سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہم اپنے رسول ﷺ کے یومِ پیدائش پر خوشی کیوں مناتے ہیں۔''

بیٹا: ''اس کا تو امی جان! مجھے علم نہیں، یہ بات آپ بتائیے''۔

ماں: ''سنو بیٹا، غور سے سنو! یہ بڑی اہم بات ہے۔ تم ذرا سوچو کہ ایک شخص اندھا ہو۔ اسے کچھ نظر نہ آئے۔ اس کی زندگی سخت مصیبت میں گزر رہی ہو کہ اتنے میں اس گاؤں میں کہیں سے ایک ڈاکٹر آجائے۔ وہ اس کی آنکھوں کا علاج کرے اور وہ اچھا ہو جائے۔ اسے سب کچھ نظر آنے لگ جائے۔ کہو کہ یہ دن اس اندھے کی زندگی میں یادگار منانے کے قابل ہوگا یا نہیں؟ کیا وہ اس دن کی یاد میں جشن منائے گا یا نہیں؟''

بیٹا: ''یہ بات تو ٹھیک ہے امی جان! وہ ضرور اس دن کی یاد میں جشن منائے گا لیکن اس بات کا عید میلاد النبی ﷺ سے کیا تعلق ہے؟''

ماں: ''بڑا گہرا تعلق ہے بیٹا! ہمارے رسول ﷺ کے آنے سے پہلے دنیا میں کہیں بھی اللہ کی تعلیم کی روشنی نہیں تھی۔ ساری دنیا اندھیرے میں تھی۔ کسی کو صحیح اور غلط راستے کی تمیز نہیں ہو سکتی تھی۔ لوگ جگہ جگہ ٹھوکریں کھاتے تھے۔ کوئی کسی بات کو سچ مان لیتا تھا تو کوئی کسی بات کو۔ ہمارے رسول ﷺ نے آکر اللہ کے علم کی روشنی ساری دنیا میں پھیلا دی۔ ہر ایک کی آنکھیں کھل گئیں۔ جھوٹ اور سچ صاف صاف طور پر الگ ہو گیا۔ غلط اور صحیح میں تمیز ہو گئی۔ یہ روشنی اللہ کی کتاب قرآن شریف ہے جو سورج کی طرح روشن ہے۔ ہم اس لئے خوشیاں مناتے ہیں کہ ہمیں ہمارے رسول ﷺ نے ایسی روشن کتاب دی جس سے ہماری آنکھوں میں بینائی آگئی۔

خصوصی اپیل

(بے مثال تفسیر قرآن کی نشر و اشاعت کے لئے تعاون کی درخواست)

غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ نے ساری عُمر قرآن کریم کی تحقیق، تعلیم اور ترویج کرنے میں بسر کی۔ اُنہوں نے خالص قرآن کی مدد سے عصرِ حاضر کے علمی، تحقیقی، سائنسی اور تنقیدی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے قرآن کے اصلی پیغام الحق کو ہم تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پینتیس سال کے لگ بھگ ہفتے کے ہر جمعہ/ اتوار کو باقاعدگی سے درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ اُن کے دروس آڈیو/ وڈیو میں منتقل کئے جاتے تھے جن میں پورے قرآن کا بڑی تفصیل سے لگ بھگ ایک ہزار گھنٹے پر محیط جائزہ لیا گیا ہے۔ بعد میں انہی ٹیپ کی مدد سے اِن دروس کو ٹائپ کر کے مطالب القرآن فی دروس الفرقان کے نام سے کتابی شکل میں 41 ضخیم جلدوں میں شائع کر دیا گیا ہے۔

ادارہ طلوع اسلام نے اِسے تبلیغ کا فریضہ خُداوندی سمجھتے ہوئے نبھایا ہے اور احباب سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اِن کُتب کو ادارہ سے خرید کر زیادہ سے زیادہ لوگوں اور اداروں تک اپنا تبلیغی فرض سمجھتے ہوئے پہنچائیں۔ اِس عمل میں اگر آپ ادارہ کو مطلوبہ افراد کی فہرست فراہم کر دیں گے تو وہ اس تفسیر قرآنی کا ایک سیٹ آپ کی جانب سے آپ کے دئے ہوئے پتہ پر بھجوا دے گا۔ تعلیمی اداروں میں خصوصی طور پر تعلیمی درسگاہیں اور پبلک لائبریریاں زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ادارہ کے پاس اِن کی فہرست موجود ہے جو ضرورت پڑنے پر مہیا کی جاسکتی ہے۔ آپ کو اِس امر سے یہ بھی تسلی رہے گی کہ آپ نے نہ صِرف اپنی طرف سے تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے ہوئے اللہ کے کام میں رفاقت کی سعادت حاصل کی ہے بلکہ ادارے کی بھی اِس فریضہ کی ادائیگی کو جاری رکھنے میں بھرپور مدد فراہم کی ہے۔

(41) اکتالیس ضخیم جلدوں پر مشتمل اِس منفرد تفسیر کا ہدیہ مبلغ 20000 روپے ہے۔ اگر آپ یہ تفسیر کسی لائبریری یا دوست کو گفٹ کرنا چاہتے ہیں تو ادارہ کو صرف -/15000 روپے ارسال کر دیجئے۔ ادارہ آپ کی جانب سے یہ تفسیر قرآن مطلوبہ لائبریری یا فرد تک بھجوا دے گا۔ عطیات کے لئے ادارہ کا اکاؤنٹ نمبر درج ذیل ہے۔ ہماری دلی تمنا یہ ہے کہ دروس القرآن کی یہ اکتالیس (41) ضخیم جلدوں پر مشتمل قرآنِ کریم کی مکمل تفسیر پاکستان کی ہر یونیورسٹی کی لائبریری کی زینت بنے تاکہ وہاں کے تمام طالب علم قرآنِ کریم کی اس بے مثال تفسیر سے استفادہ کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری معصوم آرزو کو شرف قبولیت بخش دے اور صاحب حیثیت لوگ اس سلسلے میں آگے بڑھیں اور اس کام میں ہماری مدد کریں تاکہ تبلیغ دین کے اس فریضہ سے ہم سب عہدہ برا ہو سکیں۔ شکریہ

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت ادارہ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ الحج	(22)	380	350/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورہ آل عمران (اول)	(3)	472	500/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	400	500/-	سورہ یٰسین	(36)	164	150/-
سورۃ انفال	(8)	210	250/-	سورہ الصّٰفّٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورہ توبہ	(9)	530	550/-	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورۂ یونس	(10)	360	400/-	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-	سورۂ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطّور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-	سورۂ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 56-57)	384	400/-
سورہ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-15)	500	500/-	28 واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	(58-59-60-61-62-63-64-65-66)	300	300/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-				
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	400/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ الکہف وسورہ مریم	(18-19)	532	500/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) فون نمبر: +92 42 3571 4546 +92 321 4460 787

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

پمفلٹس --- PAMPHLETS

ادارہ طلوع اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے

فی پمفلٹ قیمت 20 روپے علاوہ ڈاک خرچ

اسلام آگے کیوں نہ چلا	قرآن مجید کے خلاف گہری سازش	دوقومی نظریہ
اسلام کیا ہے؟	قربانی	عورت قرآن کے آئینے میں
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟	قیامت موجود	پاکستان کی نئی ''زیارت گاہیں''
اسلام اور مذہبی رواداری	قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!	کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟	قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر	تحقیق ربوٰ (مسئلہ سود)
اسلامی قانون کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ (مغربی پاکستان ہائیکورٹ کا فیصلہ)	ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟	کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟
اسلامی آئیڈیالوجی	ہندو کیا ہے؟	بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن
اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش (20 روپے علاوہ ڈاک خرچ)	ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ (قرآنی اصطلاحات کی تشریح)	تکذیب دین کون کرتا ہے اور مصلّی کسے کہتے ہیں
اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں	ہماری تاریخ میں کیا ہے؟	روٹی کا مسئلہ
اسلامی قانون سازی کا فریضہ (بال سے باریک تلوار سے تیز)	ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟	جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
انسانیت کا آخری سہارا	ہم عید کیوں مناتے ہیں؟	نماز کی اہمیت
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری	مقام اقبالؒ	ضبطِ ولادت (خاندانی منصوبہ بندی)
اقبال کا مردِ مومن	مقام محمدی ﷺ	علماء کون ہیں؟
اندھے کی لکڑی	مرزائیت اور طلوع اسلام	فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں
آرٹ اور اسلام	ماؤزے تنگ اور قرآن	کافرگری
قرآن کا معاشی نظام	مومن کی زندگی	حرام کی کمائی
قرآن کا سیاسی نظام	جہاں مارکس ناکام رہ گیا	عالمگیر افسانے

Surah *Muhammad* (محمّد) – Durus-al-Qur'an: Chapter 6

By G. A. Parwez (Episode No.2)
(Translated by: Mansoor Alam)

Well, let us see how was Allah doing all these things? My dear friends, just imagine what kind of heart-wrenching opposition the Prophet (PBUH) was facing? From inside the hypocrites were making his life unbearable by their mendacity and machinations against him; and from outside, the Quraysh and their supporters kept attacking repeatedly which could have made any leader crazy had it not been for high moral character, perseverance, determination, and broadmindedness of the Prophet (PBUH). In the span of seven years of Prophet's life in Medina, the Quraysh attacked him no less than eighty two times at least. Under these intense internal and external pressures the Prophet (PBUH) was facing, Allah could have revealed to him to be careful from so and so because they are hypocrites? Even this minor thing could have been a great help to the Prophet. This is worth pondering over my friends. If Allah did not even do this much as to reveal even one of the hypocrites to the Prophet, how could He and His angels have fought his enemies and defeated them in battlefield on his behalf? This point is extremely important and cannot be simply ignored as we normally do and move on with flow of status quo represented by religious establishment. The Quran wants Prophet to use intellect to find them out. This way Allah wants to set an example for us about the importance of using intellect: وَلَوْ نَشَاءُ لَأَرَيْنَاكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُم بِسِيمَاهُمْ ۚ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِي لَحْنِ الْقَوْلِ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ أَعْمَالَكُمْ (47:30) – If it was in Our program We can bring them before you one by one, so that you can properly identify them. However We will not do this as this will be against Our overall scheme of non-interference in human affairs. Nonetheless, using your own commonsense and intellect you can recognize them from the tone of their voices. As for your and their deeds are concerned, nothing remains hidden from our Law of Requital. The consequences are bound to manifest themselves.

Did you notice my friends, how important for us it is to use of intellect that even to his beloved Prophet Allah is saying: You have to use your intellect and your

understanding of human behavior to figure out who is true Muslim and who is hypocrite? If the teacher gives the solution to the child then child's ability for acquiring knowledge will be destroyed. Even to the Prophet, my dear friends, there is no favoritism shown by Allah relating to human affairs. Everyone is equal before the law of requital. وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتَّىٰ نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِينَ مِنكُمْ وَالصَّابِرِينَ وَنَبْلُوَ أَخْبَارَكُمْ (47:31) – If We were to adopt any extraordinary means there was no need of any clash or struggle. But, We want this clash to take place so that the Mujahedeen amongst you can stand out; and it would become evident to what extent they are steadfast. In other words these are the ones who are ready to sacrifice everything for the sake of establishing this system; and to face all challenges with fortitude and steadfastness? We want that everything about each of you should be revealed to the public and the whole world should see the wonderful change this Iman has brought within you.

Human machinations can never subdue the life-giving principles of revelation

The Quran next explains the principle of divine revelation: إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَشَاقُّوا الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَىٰ لَن يَضُرُّوا اللَّهَ شَيْئًا وَسَيُحْبِطُ أَعْمَالَهُمْ (47:32) – Remember! Those who deny Divine Laws, also obstruct others from the path of Allah and continue opposing the Messenger in spite of the clear guidance they have received. Tell them O Messenger, that they can do no harm to Allah. He will make all their adverse efforts and machinations go to waste.

Please note here an important point. They opposed and created hindrance in the path of Allah: مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَىٰ – after clear guidance had come. There was no confusion. There was nothing beyond comprehension. Allah made his message very clear for understanding. That is the whole purpose of sending His message. If people cannot understand Allah's message then how can they implement it. However, our religious priesthood confuses people by making wild pronouncements such as: how can our limited mind understand the Quran whose author is all powerful, all wise, all knowing? How can the Almighty's giant Book enter into such a tiny coconut? This is how religious priesthood serves as a roadblock in Quran's path. But nothing happens to Allah except that they deprive themselves and the people from Allah's path and, as a consequence, all their effort goes waste. They will never be successful.

Heaven is the result of action in the light of the divine message

One may conjecture from this that since our actions will go waste then why bother with actions; so, let us concentrate on performing extra prayers and reciting Allah-u Akbar on the beads of rosary for Allah's forgiveness. No, that is not the case. The Quran says: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ (47:33) – But O people who claim to believe! You should not think that all this will be done by

Almighty Allah Himself and that you will have to do nothing. It is therefore extremely important that you should follow and obey the Divine System that the Messengers has established – in its entirety. Do not ever take a step which causes your efforts to go waste. Do not think that this will happen naturally and automatically or that Allah will do it –and you do not have to do anything?

This obedience of Allah and the Messenger that is mentioned in the above verse (47:33) are not two separate obedience, one obedience for Allah and another obedience of the Messenger. The term – أَطِيعُوا اللَّـهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ – is a comprehensive terminology specifically employed by the Quran for obedience to Divine System that the Messengers established and those who will continue to establish after the Prophet (PBUH). The Quran is telling the believers that establish this Divine System and follow it – and don't worry about the hypocrites and their system that is bound to fail. But after the rightly guided Khalifas, Muslims deviated from the Divine System that the Prophet had established.

So, the question begs: was this divine system linked only with the Prophet's life. No, that was not the case. The Quran is very clear on this point: وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَإِن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ ۚ وَمَن يَنقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ اللَّـهَ شَيْئًا ۗ وَسَيَجْزِي اللَّـهُ الشَّاكِرِينَ(3:144) – Take note that the system based on eternal divine principles is not to be forsaken by the death of an individual, no matter how important his position may be. This principle applies even to as great a personality as Muhammad (PBUH). He is no more than a Messenger from Allah. Messengers before him have passed away. If he dies or is slain, will you then turn on your heels thinking that the system is finished? Whosoever does so will not harm Allah in any way? Allah will reward those who remain steadfast out of their conviction that the system does not depend upon personalities and will continue as long as the Book of Allah is followed.

However, the obedience to the Prophet (PBUH) was completely changed by our religious priesthood. It proclaimed that obedience to Allah is to be done through the Quran and the obedience of the Prophet (PBH) will be done through hadith. Since there are many sects (Hanafi, Maliki, Hanbali, and Shafaii) in Islam, each sect can do the obedience according to its own version of hadith. These are just four sects but religious priesthood claims that there are seventy two sects. In fact, there many more. Each sect claims that it is doing obedience of the Prophet (PBUH). When they are asked that one has to do obedience of Allah as well? The religious leaders replies that Prophet's obedience *is* the Allah's obedience.

Sharia's obedience declared as Prophet's obedience

So, the obedience of Allah and the Prophet (PBUH) became the obedience of oral

narrations collected by some Iranian compilers after two hundred fifty years after the Prophet (PBUH). Subsequently, based on these narrations some jurists complied fiqh laws voluntarily on their own according to the prevalent issues of their times, which formed the basis Sharia laws and whose obedience became the obedience of the Prophet (PBUH). These laws were lying dormant but they are being resurrected now even though our President acknowledged that they are impossible to implement. But, nevertheless, he insists on enforcing these laws known as Hudood laws.

Take for example, the law pertaining to murder that requires two Muslim eyewitnesses who must be Muttaqi. The law will not accept non-Muslim eyewitnesses; it will not accept even unanimous evidence from them of murder, no matter their number. The murderer cannot even be brought before the court let alone be charged with the murder! Someone murders her husband in front of his wife, but, according this law, a woman's evidence cannot be accepted! Even under such a restrictive law of evidence, suppose somehow the evidence is brought before the court and the person is charged with murder. But, the murderer has the option of paying off blood money to the victims' relatives and he will be released! Who are the relatives? These are the people who may have had issues with the murdered person and now have benefited from his murder. In fact, they may have planned this murder to grab the murdered person's property and wealth. The decision has been rendered according to "Islamic" Sharia for willful cold blooded murder. And this Sharia says that if the murdered person is woman then her blood money is half compared to murdered man. So, according to this Sharia, the value of life of a woman is half of man. O my brothers! I feel the extreme pain in my hearts? Do you see the blatant injustice; and naked discrimination against woman in our so-called "Islamic" Sharia? I used to read these things and used to console myself that these are old things that happened once and have been buried under grave. But now that I see them being resurrected and implemented in our society, I am completely distraught and heart-broken at the tail end of my life. No wonder Allah says: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّـهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوا أَعْمَالَكُمْ (47:33) – O who you claim to believe! You must follow and obey the Divine System that the Messengers has established, in its entirety. Do not ever take a step which causes your efforts to go waste.

Well! We are praying, fasting, and performing Hajj in record numbers. No wonder all our efforts are going waste.

My dear friends, we reached until the verse (47:33) of Surah Muhammad (محمّد). We will start our next lecture from verse (47:34) of Surah Muhammad (محمّد).

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں، انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور سُستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکام دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو، جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.72
ISSUE
11

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر اِن شاہیں بچوں کو بال و پَر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے
(اقبالؒ)

